اللہ

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ

اور میں نے جنات اور انسانوں کو اس کے سوا کسی اور کام کیلئے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری عبادت (یعنی معرفت حاصل) کریں

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

کتابچہ نمبر 20

شاہراہِ معرفت

اکابر بالخصوص مجددین رحمۃ اللہ علیہم کی تعلیمات کے تعارف کیلئے

حضرت سید شبیر احمد کاکاخیل دامت برکاتہم

مسترشد حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانی رحمۃ اللہ علیہ

و خلیفہ مجاز دیگر اکابر رحمۃ اللہ علیہم

ناشر : خانقاہ رحمکاریہ امدادیہ راولپنڈی

حضرت مجدد الف ثانیؒ، حضرت کاکا صاحبؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کے علوم
شریعت، طریقت اور حقیقت (معرفت) سے کتابچوں کا سلسلہ

شاہراہِ معرفت

کتابچہ نمبر 20

(جمادی الاولی۔1445ھ، بمطابق ہجرہ۔1402 شمسی ہجری)

(بمطابق: نومبر، دسمبر 2023ء)

زیرِ سرپرستی

حضرت شیخ سید شبیر احمد کاکاخیل صاحب مدظلہٗ العالی

مقصد: اسلاف کی تحقیقات سے اُمَّت کو آجکل کی
سمجھ میں آنے والی زبان میں روشناس کرنا

مجلس تحقیقات

زین العابدین صاحب مدظلہٗ

خانقاہ رحمکاریہ امدادیہ

مکان نمبر CB-1991/1 ۔بلمقابل جامع مسجد سیدنا امیر حمزہ
گلی نمبر 4۔اشرف لین نزد آشیانہ چوک۔اللہ آباد۔ویسرج 3 ۔راولپنڈی

فہرستِ مضامین

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
1	دیباچہ	2
2	حمدِ باری تعالیٰ	4
3	نعت شریف	5
4	عارفانہ کلام	7
5	مطالعۂ سیرت بصورتِ سوال	7
6	نظامِ تصوف سے گزری ہوئی شخصیت معاشرے کے لئے عملی نمونہ ہے	12
7	تعلیماتِ مجدّدِیہ	49
8	مقاماتِ قطبیہ و مقالاتِ قدسیہ	88
9	توضیح المعارف (قسط نہم)	118
10	خانقاہ کے شب و روز	125

دیباچہ

خانقاہ رحمکاریہ امدادیہ کے ماہانہ کتابچے ''شاہرائے معرفت''کا بیسواں شمارہ قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

اس شمارے کی ابتدا حمد و نعت سے کی گئی ہے اس کے بعد ایک کلام شامل کیا گیا ہے۔

اس شمارے میں جو نثری مضامین شامل کیے گئے ہیں، ان میں پہلا مضمون ''مطالعۂ سیرت'' کے عنوان سے ہے جس میں موجودہ دور میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہونے کے باوجود دشمن پر غلبہ نہ پانے کی وجوہات میں سے ایک بڑی وجہ تعلیم کے ساتھ تربیت کے نہ ہونے کو بیان گیا ہے۔

دوسرا مضمون حضرت سید شبیر احمد کاکاخیل دامت برکاتہم کا خیبر میڈیکل کالج پشاور میں ''نظامِ تصوف سے گزری ہوئی شخصیت معاشرے کے لئے عملی نمونہ ہے'' کے عنوان پر مفصل بیان ہے۔

گزشتہ شمارے میں ''توضیح المعارف'' کی قسط نمبر 8 شامل کی گئی تھی جس میں اللہ پاک کے وجود پر سائنسی دلائل پیش کرنے کے بعد کائنات کی تخلیق کی نوعیت، جعلِ مرکب اور جعلِ بسیط کی بحث شامل کی گئی تھی۔ اس شمارے میں قسط 9 شامل کی جارہی ہے جس میں وجود منبسط اور ظلال کے تعلق کو واضح کیا گیا ہے۔

جیسا کہ قارئین کو معلوم ہے کہ ہر شمارے میں حضرت شیخ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات میں سے مختلف مکاتیب شریفہ اور ان کی تشریح کو کتابچے میں شامل کیا جاتا ہے اسی ترتیب کو آگے چلاتے ہوئے اس بار بھی حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مختلف مکاتیب شریفہ کو شامل

کیا گیا ہے۔ گزشتہ شمارے میں درس 16 کو شامل کیا گیا تھا جس میں ''کلمات شَطْحِیّات کہنے کا جواز اور عدمِ جواز'' کے بارے میں مفصل گفتگو کی گئی تھی۔ اس شمارے میں درس 17 کو شامل کیا گیا ہے جس میں ''کاملین پہ اعتراض کرنے کی ممانعت، پیر ناقص سے طریقہ اخذ کرنے کے نقصانات، سیر و سلوک سے مقصود دلی امراض کا دور کرنا اور دل کی غیر اللہ سے رہائی کے لئے اتباع سنت سب سے بہتر ہے'' کے عنوانات پر حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مختلف مکاتیب شریفہ کی تعلیمات کو شامل کیا گیا ہے۔

حضرت کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات میں سے درس نمبر 17 شامل کیا گیا ہے جس میں حضرت کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی نماز کے بارے میں بتانے کے بعد نماز میں نیت کی اہمیت اور نماز کو درجہ کمال تک پہنچانے کے بارے میں رہنمائی کی گئی ہے۔

قارئین کرام سے گزارش ہے کہ شمارۂ ہذا کا بغور مطالعہ فرمائیں اور اپنی کیفیات و آراء سے مطلع فرمائیں۔ اللہ کریم ہماری کامل اصلاح فرمائے اور ہمیں دائمی رضا سے نوازے۔ آمین۔

سید شبیر احمد کاکاخیل عفی عنہ

حمدِ باری تعالیٰ

ایک ہی

ایک ہی ہے کہ جو کھلاتا ہے
حق کا وہ راستہ دکھاتا ہے

جو کہ دشمن ہے ازلی اپنا
جس کو وہ چاہے وہ بچاتا ہے

ہم اگر رستے سے بھٹک جائیں
وہ ہمیں راستے پہ لاتا ہے

اس کو آنکھوں سے کوئی دیکھ نہ سکے
اپنے عاشق کے دل میں آتا ہے

حسنِ دنیا پہ جو دھوکہ کھائیں
ان کو بھی وہ ہی تو سمجھاتا ہے

یہ بھی اس کا ہی فضل ہے اے شبیرؔ
یہ جو تو لوگوں کو بتاتا ہے

کتاب: ہوشِ دیوانگ

نعت شریف

ہمارے نبی پر ہوں لاکھوں سلام
پڑھوں میں درود، ان پہ ہر صبح شام

میں سیرت پڑھوں ان کی، اس پر چلوں
میں دل میں رکھوں ان کی صورت مدام

خدا کے لئے میں خدا کا بنوں
مگر ہو طریقۂ خیر الانام

میں بدعت کو جوتی سے ٹھوکر لگا دوں
جو راسخ ہے دل میں سنت کا مقام

میں شبیرؔ اپنے خدا سے یہ مانگوں
مجھے بھی پلا دے محبت کا جام

کتاب: شاہراہِ محبت

https://t.ly/AHtGs

عارفانہ کلام

اگر چاہئے اپنے رب کا ملن
تو چاہئے درست کر دیں اپنی چلن

ہمیں چھوڑنی ہوں گی خوش فہمیاں
سکھائے ہمیں یہ گزشتہ زمن

جو خود رو ہیں پودے نکالیں وہ دل سے
سنواریں محبت سے دل کا چمن

وہ جب چاہے جو بھی رکھیں سامنے
اسی وقت کریں دل سے پیش جان و تن

یہاں کے شعوب و قبائل تعارف
مگر آخرت جو ہے جانیں وطن

ہو فرض علم حاصل کم از کم شبیرؔ
ہو دل اس کی یاد میں ہمیشہ مگن

کتاب: کراماتِ قلب

https://t.ly/-RBPK

مطالعۂ سیرت بصورتِ سوال

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ O

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ O

سوال:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جماعت تیار کی، پھر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے تابعین کی جماعت تیار کی، اور انہوں نے تبع تابعین کی جماعت تیار کی۔ ان میں سے ہر جماعت کے افراد نے دین کے مختلف شعبوں میں اپنی خدمات سر انجام دیں اور ہر جماعت کے افراد نے اپنے اپنے دور میں مسلمانوں کے دشمنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ان ادوار میں اکثر مسلمانوں کا اپنے دشمنوں پر غلبہ رہا۔ ہمارے اس دور میں بھی دین کے ہر شعبے کے ہر بڑے فرد سے ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں نئے نئے افراد کسبِ فیض کر رہے ہیں اور اس طرح دین کا وہ شعبہ مسلسل ترقی کر رہا ہے، لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کا اپنے دشمنوں پر غلبہ نہیں ہو رہا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب:

اصل میں سارے شعبے اپنے اپنے طور پر مکمل ہونے چاہئیں، ان میں کمی نہیں ہونی چاہئے۔ مثلاً: ایک شعبہ بہت اچھا جا رہا ہو اور دوسرا شعبہ کمزور ہو، تو اس کی کمزوری کی وجہ سے کام گڑبڑ ہو جائے گا۔ مثلاً: ایک پہیہ ٹھیک ہو اور دوسرا ٹھیک نہ ہو، تو گاڑی کیسے چلے گی!

تعلیم اور تربیت ایسے الفاظ تھے، جو بالکل اکٹھے چلے آرہے تھے، یعنی جب کوئی تعلیم کا لفظ بولتا تھا تو ساتھ تربیت کا لفظ بھی ہوتا تھا۔ ان میں کوئی فرق نہیں تھا۔ مگر آج کل تعلیم پر تو زور ہے، لیکن تربیت شاید ہی کہیں کہیں ہو۔ تربیت کا معاملہ بہت پیچھے رہ گیا۔ کسی کالج، کسی یونیورسٹی، کسی مسجد، کسی جگہ پہ تربیت کا نظام نہیں ہے، اگر ہے، تو بہت کم ہے، جو نہ ہونے کے برابر ہے۔ جہاں تک خانقاہوں کی بات ہے، تو خانقاہیں ہیں ہی تربیت گاہیں۔ اور خانقاہ بنتی ہے کسی اللہ والے کی توجہ، فکر اور محنت سے۔ جب اللہ جل شانہٗ ان کو اس کی توفیق دیتے ہیں، تو ان کے گرد لوگ جمع ہو جاتے ہیں اور تربیت کا نظام شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن ہمارے پاکستان اور ہندوستان میں ایک بڑا مسئلہ ہے، شاید اور جگہ بھی ہو، **وَاللّٰہُ اَعْلَمُ**، اس کا تجربہ ہمیں نہیں ہے۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ لوگ بزرگ کی وفات کے بعد اس کی اولاد پہ جمع ہوتے ہیں، کسی اور پہ جمع نہیں ہوتے۔ چنانچہ اگر اولاد کی تربیت ہو چکی ہو، تو سُبْحَانَ اللہ! پھر تو بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن اگر تربیت نہ ہو چکی ہو اور باگ ڈور سنبھال لی، تو وہ خانقاہ اپنی اصل حالت پہ نہیں رہے گی۔ خانقاہ کا نام تو رہے گا، لیکن حقیقی خانقاہ نہیں ہو گی۔ وہاں صرف رسومات ہوں گی۔ اور یہ چیز multiply ہو رہی ہے۔ چنانچہ پرانی خانقاہوں میں یہ مسئلہ ہے، اور نئی خانقاہیں نہیں بن رہیں۔ نتیجتاً تربیت کا عنصر کم سے کم ہو رہا ہے۔ اور تعلیم بغیر تربیت کے تعلّی پیدا کرتی ہے، یعنی انسان اپنے آپ کو کچھ سمجھتا ہے کہ میں تو عالم ہوں، میں تو یوں ہوں۔ یہ مسئلہ صرف دینی تعلیم میں نہیں ہے، دنیاوی تعلیم میں بھی ہے۔ میں ڈاکٹر ہوں، انجینئر ہوں، پروفیسر ہوں، فلاں ہوں۔ یہی تعلّی ہے۔ ہم میٹنگوں میں شرکت کرتے رہے ہیں، وہاں ایسی تعلّی ہوتی ہے کہ آدمی حیران ہو جاتا ہے۔ بات کرنے کا ایسا انداز کہ ان سے استفادہ بڑا مشکل ہوتا ہے۔ یہ

تعلّی تربیت سے ہی ختم ہو سکتی ہے۔ لیکن تربیت کا سامان ہی نہیں ہے۔ تربیت کا سامان بھی اگر کوئی کرتا ہے، تو لوگ اس کو بھی دنیاوی مقاصد کے لحاظ سے استعمال کرتے ہیں۔ اور یہ بہت بڑا مسئلہ ہے۔ جب میں عقل، دل اور نفس کے موضوع پر یونیورسٹیوں میں لیکچر دے رہا تھا، تو انہوں نے یہ ساری باتیں قبول کیں۔ انہوں نے کہا کہ واقعی یہ بنیادی چیزیں ہیں، لیکن وہ ان (عقل، دل اور نفس) کے دنیا کے استعمال میں interested تھے۔ سکول بنتے ہیں، اوپر نام لکھا جاتا ہے: اسلامی سکول، اسلامی ماحول کے مطابق۔ جب اندر جائیں گے، تو وہی انگریز کے طریقے ہوں گے۔ جب آپ کہیں گے کہ یہ کیا ہے؟ کہتے ہیں: مجبوری ہے، کیا کریں۔ اب بتائیں کہ کہاں جائیں، پھر نتیجہ سامنے ہے۔ لہٰذا اس سے پھر گلہ نہیں ہونا چاہئے کہ نتیجہ کیا ہو۔ آپ گندم بوئیں گے، تو گندم ہی نکلے گی۔ جَو بوئیں گے، تو جَو ہی نکلیں گے۔ گندم کی جگہ جَو نہیں آ سکتے، جَو کی جگہ گندم نہیں آ سکتی۔ چنانچہ ہمارے ہاں یہ مسئلہ ہے۔ اس لئے ہمیں خانقاہوں کو آباد کرنا پڑے گا اور خانقاہوں کو صحیح کرنا پڑے گا۔ حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ نے اس فکر کی وجہ سے اخیر میں یہ مسئلہ اس طرح حل کرنے کی کوشش کی کہ اعتکاف کو خانقاہ کا نعمُ البدل بنایا جائے۔ حضرت اعتکاف ہماری طرح دس دن کا نہیں کرتے تھے، چالیس دن کا اعتکاف ہوتا تھا۔ اور چالیس دن میں تبدیلی آ جاتی ہے۔ اب خانقاہیں نہیں ہیں، اگر ہیں تو بہت تھوڑی ہیں، اور صحیح خانقاہیں تو اور بھی تھوڑی ہیں۔ ہمارے سامنے کئی خانقاہیں برباد ہو گئیں۔ چنانچہ یہی بنیادی وجہ ہے کہ ہم اس چیز سے غافل ہیں۔ خانقاہوں کا صحیح نظام نہیں بن رہا، جس کی وجہ سے مدرسوں میں لوگ بغیر تربیت کے پاس ہو رہے ہیں۔ مساجد میں بغیر اخلاص کے لوگ نماز پڑھ رہے ہیں۔ بغیر اخلاص کے لوگ جہاد کر رہے ہیں۔

بغیر اخلاص کے لوگ دعوت و تبلیغ میں چل رہے ہیں۔ آج کل کون سی چیز ٹھیک ہو رہی ہے؟ ہر جگہ مسائل ہیں۔ اور یہ مسائل اسی وجہ سے ہیں کہ یہ بنیادی عنصر کم ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ باقی چیزیں ضروری نہیں ہیں۔ مدرسہ بھی ضروری ہے، کیونکہ اس کا علم سے تعلق ہے۔ لہٰذا اگر خانقاہیں بہت زیادہ ہو جائیں اور مدرسے کم ہو گئے، تو علمی نقصان ہو گا، پھر جہالت پھیلے گی۔ اور یہ دوسرا نقصان ہو گا۔ اسی طرح دعوت و تبلیغ کم ہو گی، تو اس کا اپنا نقصان ہے۔ اگر دینی سیاست کی بات کم ہو گی، تو اس کا اپنا نقصان ہے۔ یعنی ہر شعبہ اپنے لحاظ سے مکمل ہونا چاہئے۔ سارے شعبوں کی ضرورت ہے۔ میں نے خانقاہوں کی بات اس لئے کی کہ باقی شعبوں میں کسی نہ کسی درجے میں کام ہو رہا ہے، لیکن خانقاہوں کا کام کمزور ہے۔ اسی وجہ سے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جیسے شخص جو کہ ہر فن میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں، فرماتے ہیں کہ میرا دل چاہتا ہے کہ لوگ مجھے صرف تصوف کے کام کے لئے چھوڑ دیں، کیونکہ باقی شعبوں میں لوگ ہیں، مگر اس میں بہت کم ہیں، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ میں اس شعبہ کی خدمت کروں۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ علیہ نے ہزار سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں اور ہر شعبے میں ان کا ایک مقام ہے، وہ فرماتے ہیں کہ مجھے تمام شعبوں سے disconnect کر دو، صرف ایک شعبے کے ساتھ connected رہنے دو۔ تو ہم جیسے لوگ تو دوسرے کام جانتے بھی نہیں ہیں، اس کے باوجود ہم درس بھی دینے لگیں اور جہاد بھی کرنے لگیں، اس طرح اور بھی دینی شعبے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ جہاد فرض ہو جائے، جس کو نفیرِ عام کہتے ہیں، اس میں تو سب کو جانا پڑے گا، اس میں تو کوئی بات نہیں ہے۔ اسی طرح دعوت و تبلیغ کا بھی یہی معاملہ ہے۔ یہاں جماعت کا ایک عالم ساتھی آیا تھا، وہ مجھے کہتا ہے کہ حضرت! میں بھی

مدرسہ چلاتا ہوں، میں نے مدرسہ کسی اور کے حوالہ کیا ہے، وہ ماشاء اللہ ادھر پڑھا رہے ہیں۔ آپ بھی اس طرح کریں۔ میں نے کہا: خانقاہ اور مدرسہ ایک جیسے نہیں ہوتے، میں اپنے مریدوں کو کس کے حوالے کروں؟ اس میں یہ طریقہ ہے ہی نہیں۔ میں نے کہا: آپ مدرسے کی بات کر رہے ہیں، مدرسے کے لئے یہ طریقہ ٹھیک ہے، لیکن خانقاہ کے لئے ٹھیک نہیں ہے۔ پھر میں نے ﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى﴾ (العبس: 1-2) والی بات کی۔ گویا یہ بات لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی، اس کی اہمیت لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ نتیجتاً یہی کچھ ہوتا ہے، جو ہو رہا ہے، جو بالکل سامنے ہے۔ اللہ جل شانہٗ ہم سب کو ان باتوں کی سمجھ عطا فرمادے اور پھر اس کے مطابق عمل بھی عطا فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ O

نظامِ تصوف سے گزری ہوئی شخصیت معاشرے کے لئے عملی نمونہ ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ O

اَمَّا بَعْدُ فَأَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ O بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ O

﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا O فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا O قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا O وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا﴾ (الشمس:7-10)

جناب ڈاکٹر صاحب اور مقتدر اساتذہ کرام! یقیناً میرے لئے یہ بہت بڑی سعادت کی بات ہے کہ ایک دینی خدمت کے لئے آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔ یہ جو عنوان یہاں لکھا گیا ہے، جس کی طرف حضرت ڈاکٹر صاحب نے اشارہ فرمایا ہے: **"نظامِ تصوف سے گزری ہوئی شخصیت معاشرے کے لئے عملی نمونہ ہے"** یہ اتنی بڑی حقیقت ہے، جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن آج کل کے دور میں جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ ثابت کرنے کی پوری مہارت لوگوں کے پاس موجود ہے۔ لہٰذا جو صحیح چیزیں ہوتی ہیں، ان سے لوگوں کو متنفر کیا جاتا ہے، اور جو غلط چیزیں ہیں، ان پہ لوگوں کو لایا جاتا ہے۔ یہ پوری ایک سائنس develop ہوئی ہے۔ لیکن ان چیزوں پہ صرف رونا ٹھیک نہیں ہے کہ ہم روتے رہیں کہ اس طرح ہو رہا ہے، اس طرح ہو رہا ہے۔ بلکہ اس کا مدلل جواب دینا ضروری ہوتا ہے۔ آج کل کے حالات میں اس کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے، یہ ہم

سب کی ذمہ داری ہے۔ دراصل ہماری ایک کمی ہے اور اس کمی کا ہمیں بڑا نقصان ہوا ہے۔ وہ کمی یہ ہے کہ ہم اپنے اکابر اور بزرگوں کی کتابیں نہیں پڑھتے۔ اس کی ایک وجہ بھی ہے، وہ وجہ بھی میں عرض کروں گا۔ اکابرین کی کتابیں نہ پڑھنے کا نقصان یہ ہوا کہ ان کی کتابوں کا نچوڑ دوسرے لوگوں کی زبانوں میں اور دوسرے لوگوں کی تحقیقات میں لپٹا ہوا جب ہم تک پہنچتا ہے، تو اس میں بہت ساری چیزیں شامل ہو چکی ہوتی ہیں اور وہ اصلی صورت میں موجود نہیں ہوتا۔ نتیجتاً بدگمانی کی فضا قائم ہو جاتی ہے۔ جیسے: وحدتُ الوجود اور وحدتُ الشہود اور اس قسم کی باتیں لوگ کرتے ہیں، سوشل میڈیا پر بھی چلتی ہیں، لیکن ان کی اصل حقیقت سامنے نہیں آتی۔ اور اس میں قصور ہمارا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ، ان حضرات نے اس پر بہت معرکۃُ الآراء کتابیں لکھی ہیں، تحقیقات موجود ہیں۔ میں آپ کو صرف ایک چھوٹا سا واقعہ بتاتا ہوں، جو اس مضمون سے متعلق بھی ہے اور میرا ذاتی تجربہ بھی ہے۔ میرا ایک دوست ہے عبد العلام شاہین، جو اپنے وقت کا بہت ذہین سٹوڈنٹ تھا، آج کل کراچی میں ہے۔ اس نے سوشالوجی میں داخلہ لیا، تو مجھے کہا کہ میں نے آج سوشالوجی میں داخلہ لیا ہے۔ میں نے کہا: سوشالوجی کیا ہوتا ہے؟ کہتا ہے: اس میں سوسائٹی یعنی عمرانیات کے متعلق باتیں ہوتی ہیں۔ میں نے کہا: ان شاء اللہ کل سے اس پر discussion کریں گے۔ اس نے مجھے contents بتا دیئے۔ ہمارے گاؤں کے پاس دریائے کابل ہے، تو ہم دریائے کابل کے کنارے چہل قدمی کرتے تھے۔ وہ مضمون بتاتا اور پھر ہم اس پر بات کرتے۔ چار پانچ دن کے بعد اس نے مجھے کہا کہ آپ نے یہ سوشالوجی کہاں

سے پڑھی ہے؟ میں نے کہا: میں نے تو سوشالوجی کا نام ہی آپ سے سنا ہے۔ کہتا ہے: آپ تو میرے ساتھ ایسے discuss کر رہے ہیں کہ جیسے آپ اس کو پڑھ چکے ہیں۔ میں نے کہا: اچھا! بتاتا ہوں، آؤ میرے ساتھ۔ اس کو میں اپنی بیٹھک میں لے گیا اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ کی چند جلدیں میں نے اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دیں۔ چونکہ میں نے اس کی باقاعدہ کوئی تیاری تو نہیں کی تھی، اس لئے اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ ورق گردانی کرتے کرتے کوئی ایک پوائنٹ نکل آتا، تو وہ میں اس کو دکھاتا کہ اس میں یہ ہے۔ پھر اور ورق گردانی کرتے کرتے کوئی دوسرا پوائنٹ بتاتا۔ جب چار پانچ پوائنٹ میں نے بتائے، تو کہتا ہے: یہاں تو سب کچھ ہے۔ میں نے کہا: یہی بات تو ہم کہتے ہیں کہ یہاں سب کچھ ہے، لیکن لوگ اس کو پڑھتے نہیں ہیں۔ اس لئے نہیں پڑھتے کہ ہم نے عربی اور فارسی سے اپنے آپ کو اتنا دور کر دیا ہے کہ یہ چیزیں سمجھ نہیں آتیں۔ کیونکہ علمائے کرام کی باتوں میں تھوڑی بہت عربی تو آتی ہے۔ جیسے ہم آج کل بلا تکلف درمیان میں انگریزی کے الفاظ بولتے ہیں، یعنی زبان بولتے ہیں اردو یا پشتو کی، لیکن اس میں اتنی انگریزی ہوتی ہے کہ اس کو اردو یا پشتو کہنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ گفتگو کے درمیان انگریزی بولتے رہتے ہیں اور ہمیں پتا ہی نہیں چلتا کہ ہم کتنی انگریزی بول رہے ہیں۔ اسی طرح علمائے کرام کی باتوں میں عربی بھی ہوتی ہے، فارسی بھی ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ ہم اس سے دور ہو چکے ہیں، لہٰذا ہمیں وہ زبان بڑی مشکل لگتی ہے، اور ہم کہتے ہیں کہ یہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ حالانکہ اس کو اگر بار بار پڑھا جائے، تو صرف چار پانچ دفعہ پڑھنے کے بعد انسان کو سمجھ بھی آنے لگتی ہے اور پھر مزید چیزیں بھی آسان ہو جاتی ہیں۔

بہر حال! میں اپنے موضوع سے زیادہ دور نہیں جانا چاہتا۔ چند بنیادی اصطلاحات جو اس

عنوان میں ہیں۔ پہلی چیز ہے شخصیت (personality)۔ اس میں کیا ہوتا ہے؟ ہر شخص کی شخصیت تین چیزوں سے بنتی ہے: اس کی عقل سے، اس کے نفس کی حالت سے اور اس کے دل کی حالت سے۔ اس پر ان شاءاللہ میں بعد میں عرض کروں گا۔ لیکن اس وقت آپ اتنا سمجھ لیں کہ اگر ان تینوں کا امتزاج (combination) کچھ ایسی حالت اختیار کر لے جو کہ موزوں ترین (optimum) ہو، تو یہ بہترین شخصیت بن جاتی ہے۔ اور اگر اس میں گڑبڑ ہو، کوئی افراط و تفریط ہو، تو اس سے اتنے مسائل بنتے ہیں، جس طرح دوسری چیزوں میں بنتے ہیں۔ دوسرا لفظ ہے ''معاشرہ''۔ معاشرہ کسے کہتے ہیں؟ جتنے بھی افراد مل کر رہتے ہیں، آپس میں ملتے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات رکھتے ہیں، ایک دوسرے کے کام آتے ہیں، ان تمام چیزوں سے معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ اور یہ تمام چیزیں کرنے کو معاشرت کہتے ہیں۔ معاشرت ایسا مضمون ہے، جس کو بہت زیادہ نظر انداز کیا گیا ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے متعلق ارشاد فرمایا کہ بہت سارے لوگ صرف عبادات کو دین سمجھتے ہیں۔ ان میں سے چند ایک لوگ معاملات کو بھی دین سمجھ لیتے ہیں کہ یہ بھی دین ہے۔ لیکن معاشرت کو تو کوئی آج کل دین ہی نہیں سمجھتا۔ لہٰذا ہماری معاشرت دوسری بنیادوں پہ کھڑی ہے، جو ہماری اسلامی بنیادیں نہیں ہیں۔ نتیجتاً دوزخ کا معاشرہ بن جاتا ہے اور اس میں ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مثلاً: معاشرے میں یہ بھی ہوتا ہے کہ دکان دار گاہک پہ ظلم کر دے، گاہک اس کا بدلہ کسی اور سے لے لے۔ مثلاً: اگر وہ ڈاکٹر ہے، تو مریض سے اس کا بدلہ لے لے۔ وہ کسی اور سے اس کا بدلہ لے لے اور وہ پھر کسی اور سے اس کا بدلہ لے لے۔ اس طرح سارا معاشرہ بالکل جہنم کا معاشرہ بن جاتا ہے۔

اگر یہ سارے دوسروں کے مفادات کے لحاظ سے انصاف کرتے، تو پھر بھی یہی حالت رہتی، حالت تو تبدیل نہیں ہونی تھی، لیکن وہ معاشرہ جنت کا ہوتا، سب لوگ سکون کے ساتھ رہ رہے ہوتے۔ لیکن اب ایک دوسرے پر ظلم کر رہے ہیں، اور ظلم کا معاشرہ ہے۔ لہٰذا معاشرے کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ بات ہونی چاہئے۔ میں آپ کو اس کی ایک سائنسی طور پر (scientifically) مثال دے سکتا ہوں کہ اگر کوئی شخص سمندر میں پتھر پھینکے، تو ریاضی کے نقطہ نظر سے (Mathematical point of view) سے اس پتھر کا اثر (effect) پورے سمندر میں پہنچتا ہے، یعنی سمندر میں جو لہریں بنتی ہیں۔ اگرچہ کچھ دور جا کے وہ decay ہوتی نظر آتی ہیں جیسا کہ بالکل نہیں ہیں۔ لیکن اگر بہت حساس آلات (Sensitive instruments) ہوں، تو اس کا اثر بہت دور بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اور پھر جتنے بھی پتھر گرتے ہیں، ان سب کا ایک امتزاج (combination) بنتا ہے۔ اسی طرح جتنے افراد معاشرے کو متاثر کرتے ہیں، اس سے ان کی معاشرت یا اچھی بنتی ہے یا بری بنتی ہے، اس کا ایک خالص نتیجہ (Net result) بنتا ہے۔ اللہ جل شانہٗ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے: ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ﴾ (الروم:41)

ترجمہ: ”لوگوں نے اپنے ہاتھوں جو کمائی کی، اس کی وجہ سے خشکی اور تری میں فساد پھیلا“۔

یہ فساد اس لئے ہوتا ہے کہ اگر ہم صحیح طریقے سے زندگی نہ گزاریں، تو میرا ایک غلط بول، میرا غلط دیکھنا، میرا غلط سوچنا، میری غلط حرکت، یہ سب پورے معاشرے کو متاثر کر رہی ہیں۔ لہٰذا

صرف میں اس سے متاثر نہیں ہوں گا، میرے پڑوسی بھی متاثر ہوں گے، میرے گھر والے بھی متاثر ہوں گے۔ یہاں تک کہ نفسیاتی ماہرین نے ایک بات کہی ہے، **وَاللّٰہُ اَعْلَمُ**، کتنی صحیح ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جس کو پاگل دیکھو، تو پاگل وہ بھی ہے، لیکن اصل پاگل اس کے پیچھے ہے، جس کا لوگوں کو پتا نہیں ہے یعنی جس نے اس کو پاگل بنایا ہے۔ بہر حال! معاشرے کے اندر یہ مسائل چلتے ہیں۔ اللہ جل شانہٗ نے اس چیز کو سمجھانے کے لئے ایک پوری سورت یعنی سورت الشمس اتاری ہے۔ ابھی میں قاری صاحب کی تلاوت سن رہا تھا، تو میں نے دل میں کہا: کاش! یہ سورت تلاوت فرماتے۔ اس موقع کے لئے بہترین presentation سورت الشمس سے ہو رہی تھی۔ اس پوری سورت میں اللہ جل شانہٗ نے نفس کو متعارف کروایا ہے اور پھر نفس کی اصلاح سے کیا ہوتا ہے اور نفس کی اصلاح نہ ہو، تو کیا ہوتا ہے اور پھر زبردست مثال دی اور مثال بھی معاشرے کی دی ہے یعنی اجتماعی مثال دی ہے۔ اس میں اللہ جل شانہٗ نے گیارہ قسمیں کھائی ہیں، حالانکہ ایک قسم بھی اللہ تعالیٰ کے لئے ضروری نہیں ہے، لیکن ہم لوگوں کے لئے اللہ پاک نے گیارہ قسمیں کھا کر فرمایا کہ اس نفس کے اندر میں نے دو چیزیں رکھی ہیں۔ یعنی اس کا فجور اور اس کا تقویٰ الہام کیا ہے۔ اور اگرچہ اجازت ہوتی ہے کہ آپ جو بھی اختیار کرنا چاہیں کر لیں، لیکن اس کے نتائج بھگتنے ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ **قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا O وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا** ﴾ (الشمس:9-10)

ترجمہ: ”فلاح اسے ملے گی جو اس نفس کو پاکیزہ بنائے۔ اور نامراد وہ ہوگا، جو اس کو (گناہ میں) دھنسادے“۔

ابتدائی طور پر نفس کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ جب انسان پیدا ہوتا ہے، تو وہ نفسِ امّارہ کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اور شیطان کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ نفسِ امّارہ برائی کی طرف مائل کرنے والا نفس ہے۔ اگر اس کی تربیت نہ کی جائے، تو تباہی کے لئے یہی کافی ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا﴾ (الشمس:10) اور اگر اس کی تربیت کی جائے، نفسِ مطمئنہ بنا دیا جائے، تو اس کے لئے فرماتے ہیں: ﴿يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ O ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً﴾ (الفجر:27-28)

ترجمہ: ''(البتہ نیک لوگوں سے کہا جائے گا کہ) اے وہ جان جو (اللہ کی اطاعت میں) چین پا چکی ہے۔ اپنے پروردگار کی طرف اس طرح لوٹ کر آ جا کہ تو اس سے راضی ہو، اور وہ تجھ سے راضی''۔

اللہ پاک نے جو مثال دی ہے، وہ قومِ ثمود کی دی ہے کہ ایک شقی بدبخت اپنے نفس کی خواہش کو پورا کرنے کے لئے اس اونٹنی کو شہید کرنے کے لئے تیار ہو گیا جو معجزانہ طور پر اللہ پاک نے بھیجی تھی۔ چٹان سے برآمد ہوئی تھی اور بہت بڑی اونٹنی تھی۔ پانی پینے کی باریاں مقرر تھیں، تو وہ اپنی باری پہ پانی پیتی۔ بعد میں پھر دوسرے لوگ پانی پیتے۔ اس بدبخت نے اپنے نفس کی خواہش کی بنیاد پر اس اونٹنی کو مارنا چاہا، تو پیغمبر نے کہا: ایسا نہ کرو، یہ اللہ کی اونٹنی ہے اور اس کی باری ہے۔ اس نے بات نہیں مانی اور اس کو شہید کر دیا۔ جب اس اونٹنی کو شہید کر دیا، تو ان پہ اللہ پاک کا عذاب نازل ہو گیا، پوری قوم کو ملیامیٹ کر دیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا O وَلَا

یَخَافُ عُقْبٰهَا ﴾(الشمس:14-15)

ترجمہ: ''نتیجہ یہ کہ ان کے پروردگار نے ان کے گناہ کی وجہ سے ان کی اینٹ سے اینٹ بجا کر سب کو برابر کر دیا۔ اور اللہ کو اس کے کسی برے انجام کا کوئی خوف نہیں ہے''۔

گویا ایک شخص نے اپنے نفس کی خواہش کو پوری کیا اور دوسروں نے اپنے نفسوں کے لئے اس کا ساتھ دیا، یعنی اس کی مخالفت نہیں کی، تو نتیجتاً سب کے سب تباہ و برباد ہو گئے۔ بالکل اسی طرح ہمارے معاشرے تباہی کے دھانے پہ پہنچتے ہیں اور پھر بعد میں بھگتتے ہیں۔ لہٰذا ہمارا اپنا فائدہ اس میں ہے کہ ہم اس سسٹم کو سمجھ جائیں اور ہم اگر اپنے آپ کو بچانا چاہیں، تو کم از کم بچا سکیں اور کیسے معلوم ہو کہ کس طریقے سے ہم اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں، اس کے لئے اللہ پاک نے ہم مسلمانوں کو جو نظام دیا ہے، وہ ہے شریعت۔ شریعت کیا چیز ہے؟ اللہ پاک نے اوامر و نواہی کے جو قوانین بھیجے ہیں کہ یہ کرو، یہ نہ کرو، یہ شریعت ہے۔ دراصل بہت ساری باتیں تو ہم جانتے ہی نہیں ہیں۔ مثلاً: اسلام نے جو باتیں بتائی ہیں، تو کچھ باتیں آج سے چودہ سو سال پہلے کسی کو پتا نہیں تھیں، لیکن آج ہمیں پتا ہیں۔ اور جو ابھی پتا نہیں ہیں، ممکن ہے کہ کچھ سالوں کے بعد وہ بھی پتا چلنا شروع ہو جائیں۔ لیکن اللہ جل شانہٗ نے ہمیں جو قوانین دیئے ہیں، یہ آفاقی قوانین ہیں، وہ روزِ ازل سے ہی ہیں، چاہے ہمیں پتا چلے یا نہ چلے۔ لہٰذا جو ایمان بالغیب کی بنیاد پر ان پر یقین کر لے، تو اس کی پوری دنیا بھی درست ہو جاتی ہے اور آخرت بھی درست ہو جاتی ہے۔ اور اگر کوئی ان پر یقین نہیں کرتا، عمل نہیں کرتا، تو ان کی دنیا بھی خراب ہو جاتی ہے اور آخرت بھی خراب ہو جاتی ہے۔ میرے ایک دوست ہیں ایرج جلال، جو جنیوا میں بہت بڑے عہدے پر تھے، شاید اب ریٹائر ہو چکے ہوں۔

انہوں نے مجھے کہا: شبیر! یار، یہ تم کیا کر رہے ہو؟ تم کہاں پر ہو؟ آج دنیا چاند پر پہنچ گئی ہے، تمہاری پرانی باتیں ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ جب ہم ذرا اونچے عہدہ پہ پہنچ جائیں، تو ہمیں مسلمان ہونا پسند نہیں ہوتا۔ یہ کتنی بد قسمتی کی بات ہے۔ بہر حال! مجھے اس نے کہا کہ لوگ کہاں پہنچ چکے ہیں اور آپ کیا کر رہے ہیں؟ میں نے کہا: میں آپ سے ایک سوال کرتا ہوں۔ میں نے اس سے پہلا سوال یہ کیا ہے کہ یہ بتاؤ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین دنیادار تھے یا دین دار؟ اس نے کہا: صحابہ کرام تو دین دار تھے۔ میں نے کہا: دنیا کے لحاظ سے دنیا میں کامیاب تھے یا نہیں تھے یا ہم ان سے زیادہ کامیاب ہیں؟ انہوں نے کہا: وہ کامیاب تھے۔ آپ حضرات بھی اس بات سے متفق ہوں گے کہ صحابہ کرام دنیا میں ہم سے زیادہ کامیاب تھے۔ آج کل ہمارے سر غیر مسلموں کے لئے فٹ بال بنے ہوئے ہیں، جس طرح بھی kick لگانا چاہیں، تو لگا لیتے ہیں۔ جب کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا معاملہ یہ تھا کہ ان سے سارے ڈرتے تھے، تھر تھر کانپتے تھے۔ گویا دنیا میں بھی وہی کامیاب تھے، سکون بھی ان کے پاس سب سے زیادہ تھا۔ بہر حال! اس نے کہا کہ وہ دنیا میں زیادہ کامیاب تھے۔ میں نے کہا: آپ کی theory تو فیل ہو گئی۔ آپ تو کہتے ہیں کہ تم کہاں ہو؟ گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں آپ کی طرح ہو جاؤں اور سب کچھ چھوڑ دوں، تو میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ میں آپ کی طرح دنیادار آدمی ہوں، صحابہ کرام تو دنیادار نہیں تھے، وہ کامیاب تھے۔ اب میں ان کی طرح ہو جاؤں یا آپ کی طرح ہو جاؤں؟ بس اس کے بعد اس نے کچھ نہیں کہا۔ تو میں عرض کر رہا تھا کہ شریعت یہی چیز ہے۔ شریعت میں ہمارے سامنے یہی چیز رکھی گئی ہے۔ اب اگر اس پر عمل کر لیں، تو ہم کامیاب ہو جائیں گے۔ دنیا میں بھی اور دین میں

بھی۔ لیکن عمل کیسے کریں؟ عمل کرنے میں جو رکاوٹیں ہیں، ان کو دور کرنا ہے۔ جیسے ہمارا نفس رکاوٹ ہے، ہمارا دل رکاوٹ ہوتا ہے، ہماری عقل رکاوٹ ہوتی ہے، ان کو کیسے ٹھیک کریں؟ اس کے لئے طریقت ہے۔ یعنی وہ طریقے (procedures) جن سے ہماری رکاوٹیں دور ہو جائیں، ان کو ہم طریقت کہتے ہیں۔ گویا عملی طور پر (practically) طریقت سے گزرنا ہمیں شریعت پر لاتا ہے اور شریعت پر آنا، یہ معاشرے کو بہتر کرتا ہے اور معاشرے کی بہتری ہماری دنیا و آخرت یعنی دونوں جہانوں کی کامیابی کی ضمانت ہمیں دیتی ہے۔ الحمد للہ اس سے یہ ٹاپک کچھ justify ہوا ہے۔ ان شاء اللہ ابھی detail میں جا رہے ہیں۔ لیکن کم از کم یہاں تک بات سمجھ میں آگئی ہے۔

معاشرتی تعلیمات میں نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: ''مسلمان وہ ہے، جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان سلامت رہیں''۔ ہم میں ہر ایک چاہتا ہے کہ ہم دوسروں سے سلامت رہیں؟ کوئی بھی ایسا نہیں ہے، جو یہ نہ چاہتا ہو۔ لہٰذا جو اس پر عمل کرے گا، تو اس میں سب کا فائدہ ہو گا۔ دوسری حدیث مبارکہ ہے کہ: ''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی پسند نہ کرے، جو اپنے لئے کرتا ہے''۔ آج کل کی management کا اعلیٰ اصول یہی ہے کہ جو فیصلہ (decision) کر رہا ہے، وہ یہ سوچ لے کہ جو میرے سامنے کھڑا ہے، یہ اگر میری جگہ پر ہوتا اور میں اس سے جو چاہتا، اب مجھے وہ اس کو دینا چاہئے۔ تاکہ یہ مطمئن رہے اور میرا کام بھی ہوتا رہے۔ جیسے میں نے پہلے بات کی تھی کہ معاشرے میں لوگ ایک دوسرے پہ ظلم کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک دوسرے پہ ظلم کرنے کا کیا نقصان ہوتا ہے؟ بیڑا غرق تو فیکٹری کا ہوتا ہے۔ بیڑا غرق تو انسٹیٹوٹ کا ہوتا ہے۔ استاد اگر شاگرد پہ ظلم کرے

اور شاگرد استاد پہ کرے، تو نتیجہ یہی ہوگا کہ انسٹیٹیوٹ تباہ ہو جائے گا۔ لہٰذا ان چیزوں سے نکلنے کے لئے ہمارے پاس یہی راستہ ہے کہ ہم سوچیں کہ میں اگر ٹیچر ہوتا، تو میں سٹوڈنٹس سے کیا چاہتا۔ اور ٹیچر کو یہ سوچنا چاہئے کہ اگر میں سٹوڈنٹ ہوتا، تو میں ٹیچرز سے کیا چاہتا۔ گویا شاگرد اپنے آپ کو استاد فرض کرے اور استاد اپنے آپ شاگرد فرض کرے، تو اس وقت اس کا جو بہترین فیصلہ ہوگا، وہ نافذ کرلے، تو حالت بہتر ہو جائے گی۔

اصلاح کیوں ضروری ہے؟ دراصل ایک ہوتی ہے انفرادی اصلاح اور ایک ہوتی ہے اجتماعی اصلاح۔ انفرادی اصلاح بھی اہم ہے، کیونکہ اس کے بغیر اجتماعی اصلاح ہو نہیں سکتی۔ لیکن اجتماعی اصلاح بھی ضروری ہے، کیونکہ اس کے بغیر انفرادی اصلاح برقرار نہیں رہ سکتی، بہت مشکل ہو جاتی ہے۔ میں آپ کو انفرادی اصلاح کی ایک مثال دیتا ہوں۔ ایک دفعہ میں ایک جلسے میں بیٹھا تھا، جلسے میں بھگدڑ مچ گئی اور سارے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ پتا نہیں کہ کیا وجہ تھی، وہ تو مجھے معلوم نہیں ہوئی۔ اسٹیج سے ایک آواز آرہی تھی کہ بزرگو اور دوستو! اپنے آپ کو بٹھاؤ، کسی اور کو نہ بٹھاؤ۔ بزرگو اور دوستو! اپنے آپ کو بٹھاؤ، کسی اور کو نہ بٹھاؤ۔ پانچ منٹ میں سارا مجمع بیٹھا ہوا تھا۔ یہ برکت اسی بات کی تھی کہ ''اپنے آپ کو بٹھاؤ''۔ لیکن اگر ہر شخص دوسرے لوگوں کو بٹھاتا، تو مجمع کبھی نہ بیٹھتا۔ لہٰذا جو دوسروں کی اصلاح کرتے ہیں اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں، ان کے ساتھ پھر یہی ہوتا ہے۔ سارے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ چنانچہ اپنی اصلاح تو اس لحاظ سے ضروری ہے۔ لیکن اجتماعی اصلاح کے لئے کچھ اجتماعی قوانین کی ضرورت پڑتی ہے، تاکہ سب لوگ ان قوانین کی پابندی کریں۔ مثلاً: ٹریفک کے قوانین ہیں، اگر ہم سارے لوگ ٹریفک کے قوانین کی پابندی کریں، تو

سب کو فائدہ ہوگا۔ اس میں پوری کوشش کی جاتی ہے کہ سب کو فائدہ ہو۔ اگر کوئی ایک خلاف ورزی کرتا ہے، تو اس کا سب کو نقصان ہوتا ہے اور جب سب اس کی پابندی کرتے ہیں، تو یہ سب کو فائدہ دیتا ہے۔ لیکن قوانین کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر قوانین نہ ہوں، تو پابندی کس چیز کی کریں گے؟ لہٰذا معاشرت کے لئے اچھے قوانین کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر آپس میں خواہشات اور مفادات میں ٹکراؤ ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر ہماری خواہشات اور مفادات کسی قانون کے ساتھ ٹکرا جائیں، تو آدمی اس کی پابندی نہیں کرتا اور اپنے آپ کو بھی خطرے میں ڈالتا ہے اور دوسروں کو بھی خطرے میں ڈالتا ہے۔

مثلاً: ایک شخص سگنل پر کھڑا ہے، سرخ بتی جل رہی ہے، لیکن ابھی کوئی گاڑی وغیرہ نظر نہیں آرہی، وہ کہتا ہے کہ کوئی نہیں ہے، چلو۔ اور اچانک کسی جگہ سے کوئی آئے، تو حادثہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ حادثے کی تعریف یہی ہے کہ دو یا دو سے زیادہ افراد کا کسی جگہ کسی event کے لئے اتفاقاً ایک ہو جانا۔ یعنی یہ بھی ادھر پہنچنا چاہتا ہے اور وہ بھی ادھر پہنچنا چاہتا ہے۔ دونوں کا فیصلہ یہ ہو اور وقت بھی ایک ہو، تو حادثہ (accident) ہوگا، چاہے وہ غلطی سے ہی کیوں نہ ہو۔ لہٰذا اگر ہم لوگ قوانین کی پابندی نہ کریں، تو نقصان ہوگا۔ چونکہ مفادات اور خواہشات دنیا کے لئے ہوتی ہیں اور دنیا کی محبت تمام خطاؤں کی جڑ ہے، اس لئے کہ دنیا کی محبت میں انسان خود غرض ہو جاتا ہے۔ اپنے آپ کو دیکھتا ہے کہ میرے پاس یہ چیز ہو، لہٰذا دوسروں کا احترام نہیں کرتا، دوسروں کا خیال نہیں رکھتا، تو دوسرے سارے لوگوں کو نقصان پہنچاتا ہے اور اپنے آپ کو بھی نقصان پہنچاتا ہے۔

اب میں عقل، قلب اور نفس کے بارے میں عرض کرتا ہوں۔ ان تینوں میں سے ہر ایک کا

اپنا کام ہے، ہر ایک باقی دو سے متاثر ہے اور ہر ایک باقی دو پر اثر انداز ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی مثال یہ دی ہے کہ جیسے کہ سینگ والے دو جانور آپس میں سینگ اڑا لیں اور دونوں ایک دوسرے کو دبائیں۔ فرمایا: اسی قسم کی حالت عقل اور نفس میں ہوتی ہے۔ نفس اور عقل میں ہوتی ہے، قلب اور عقل میں ہوتی ہے، عقل اور قلب میں ہوتی ہے، قلب اور نفس میں ہوتی ہے، نفس اور قلب میں ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح ٹکراؤ ہوتا ہے۔ آگے جا کر میں عرض کروں گا کہ اس میں توازن (balance) کس طرح لایا جاتا ہے، کیونکہ خوبی تو توازن (balance) میں ہے۔

لطائف کی مثال milestones کی ہے۔ ادراک اور محسوسات کا نظام اور ملاءِ اعلیٰ کے ساتھ رابطوں کے ذرائع۔ اصل میں جیسے میں نے عرض کیا کہ یہ باتیں آپ حضرات کو ذرا اجنبی لگیں گی، لیکن یہ موجود ہیں۔ ہمارے اندر ادراک و محسوسات کا نظام موجود ہے، یہ سب مانتے ہیں۔ ڈاکٹر لوگ بھی مانتے ہیں، سائنسدان بھی مانتے ہیں، لیکن ہمارا اوپر کے ساتھ کیا رابطہ ہو سکتا ہے، یہ ذرا الگ مضمون ہے۔ اس پہ مزید بات کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن بہر حال! یہ تو ہم سب مانتے ہیں کہ ہماری آنکھیں ہمارے دل پر اثر انداز ہیں اور ہمارا دل ہماری آنکھوں پہ اثر انداز ہے۔ اگر میں اچھے خیال کا ہوں یعنی اگر میرا دل بنا ہوا ہے، تو کیا میں نظر غلط استعمال کروں گا؟ نہیں کروں گا۔ اور اگر نظر غلط استعمال ہو گئی، تو کیا دل محفوظ رہے گا؟ نہیں رہے گا۔ گویا آنکھیں دل کو متاثر کر رہی ہیں اور دل آنکھوں کو متاثر کر رہا ہے۔ یہ آپس میں تعامل (interaction) ہوتا ہے۔ لیکن یہ دوسری بات میں ان شاء اللہ بعد میں کروں گا۔ اس کے ذریعے سے اہلِ تمکین کا راستہ معلوم ہو سکتا

ہے، کیونکہ تلوین میں تو سب ہوتے ہیں، اس لئے اہلِ تمکین بننا پڑتا ہے۔ یہ ایک قسم کی عظیم نعمت ہے۔ اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے جو ماڈل پیش کیا ہے، یہ متاخرین کے لئے بہت بڑی نعمت ہے۔ میں رفاہ یونیورسٹی کی نصاب کمیٹی میں تھا، تو وائس چانسلر ڈاکٹر انیس صاحب بیٹھے ہوئے تھے، ان کے چیف ایگزیکٹو اسد اللہ خان صاحب تھے۔ ہم discuss کر رہے تھے کہ کون سی چیز کس طریقے سے کی جائے۔ میری زبان سے اس ماڈل کے بارے میں بات نکل گئی۔ اسد اللہ خان صاحب اچھل گئے۔ کہتے ہیں کہ یہ آپ نے کہاں سے لیا ہے؟ میں نے کہا کہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے۔ کہتے ہیں کہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کو تو میں نے بھی پڑھا ہے، اس میں تو یہ نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ آپ نے ان کی ہسٹری پڑھی ہے اور یہ ان کی کتابوں میں ہے، میں نے کتاب پڑھی ہیں۔ اس کتاب کا نام ''الطافُ القدس'' ہے، اس میں یہ موجود ہے، آپ اس کو خود پڑھ سکتے ہیں۔ الحمد للہ وہ بہت ذہین آدمی ہیں، بعد میں انہوں نے پڑھا اور پھر انہوں نے ماشاء اللہ لیکچر بھی دیا اور کہا کہ اس میں تو ہمارے سارے مسائل کا حل ہے، اس پہ آپ کچھ مضمون تیار کر لیں اور ہمیں ایڈریس کریں۔ چنانچہ متاخرین کے لئے یہ خصوصی انعام ہے۔

اب میں ذرا ایک ایک کر کے اس میں سے گزرتا ہوں۔

عقل کے کام: گزشتہ باتوں کو یاد رکھنا، آئندہ امور کے متعلق سوچنا۔ یعنی حافظہ بھی اس کے ساتھ ہے اور آئندہ امور کے متعلق سوچنا بھی ہے۔ کسی چیز کو سمجھنا، کسی چیز کی معرفت اور یقین حاصل کرنا، صحیح فیصلے کی استعداد۔ یہ عقل کا کام ہے۔ یعنی اگر کوئی عقل مند ہو گا، تو صحیح فیصلہ کرے گا، صحیح معلومات لے گا، ان کا صحیح تجزیہ (Analysis) کرے گا، ان سے صحیح نتیجہ نکالے

گا، پھر ان کے مطابق صحیح فیصلے کرے گا۔ چاہے وہ دنیا کا معاملہ ہے، چاہے آخرت کا معاملہ ہے، اس سے فرق نہیں پڑتا۔ دنیا کے لئے بھی یہی طریقہ کار ہے اور آخرت کے لئے بھی یہی طریقہ کار ہے کہ ہم اپنی عقل کو کیسے استعمال کرتے ہیں۔

قلب کے کام: یہاں پر ذرا تھوڑی تفصیل سے بات چلے گی۔ غصہ، ندامت، خوف، جرأت، فیاضی، بخل، محبت، عداوت، یہ سارے دل کے کام ہیں۔ دل میں اگر بعض کے لئے کچھ چاہتیں ہوں اور بعض کے لئے نفرتیں ہوں، یہ بھی دل کا کام ہے۔ یہ تو میرے خیال میں ایسی بات ہے کہ جس کو ایک بچہ بھی سمجھ سکتا ہے۔ اگر کسی سے پوچھیں کہ اگر آپ کو کسی کے ساتھ محبت ہے، تو کہاں محسوس ہوتی ہے؟ وہ کہے گا: دل میں۔ کیوں کہ محبت دل میں ہوتی ہے۔ سر میں تو نہیں ہوتی۔ اور اگر کسی کے لئے نفرت ہو، تو وہ بھی دل میں محسوس ہوتی ہے۔ وہ باقاعدہ repel کرتا ہے، اگر آپ اس کے گلے لگنا چاہیں، تو نہیں لگ سکتے، باقاعدہ repulsion ہوتی ہے۔ گویا نفرت بھی دل میں ہے اور محبت بھی دل میں ہے۔ اور ان سب امور کو شریعت کے مطابق کرنا، یہ اصلاح ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نصیب فرمادے۔

نفس کے کام: خواہشات کو پورا کرنا، لذات کی اتباع، جسم کی ساخت کو قائم رکھنا۔ مثلاً: مجھے بھوک لگتی ہے، تو یہ نفس کا کام ہے، پیاس لگتی ہے، تو یہ نفس کا کام ہے، مجھے کوئی چیز پسند ہے، تو یہ نفس کا کام ہے، میں کوئی چیز کھانا چاہتا ہوں، تو یہ نفس کا کام ہے، کوئی کپڑے مجھے پسند ہیں، تو یہ نفس کا کام ہے۔ کوئی گاڑی مجھے پسند ہے، تو یہ بھی نفس کا کام ہے۔ یہ سارے نفس کے کرشمے ہیں۔ لیکن ان میں جائز اور ناجائز کی تمیز شریعت بتاتی ہے۔ آپ کی کون سی خواہش جائز ہے، کون سی

نا جائز ہے، یہ شریعت بتاتی ہے۔ مثلاً: میں کہتا ہوں کہ ساری دولت میرے بینک میں جمع ہو جائے۔ شریعت کہتی ہے کہ یہ جائز نہیں ہے۔ لہٰذا میں اگر اس کو حاصل کرنے کے لئے کسی پہ ظلم کرنا چاہوں، تو وہ جائز نہیں ہو گا۔ چنانچہ شریعت ہماری رہنمائی کرتی ہے کہ کون سی چیز جائز ہے، کون سی جائز نہیں ہے۔ گویا نفس کی خواہشات کو شریعت محدود کرتی ہے۔ اگر وہ میری ضرورت ہے، تو شریعت اجازت دیتی ہے۔ جیسے آپ ﷺ نے فرمایا: **''إِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا''**

(ابوداؤد، حدیث نمبر:1369)

ترجمہ: ''بے شک تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے''۔

اور اگر میری ضرورت نہیں ہے، میری خواہش ہے اور غیر محدود ہے، تو پھر اس کو چیک کرنا پڑے گا۔ ان چیزوں کا دفع کرنا جنہیں دور کرنا بدن کا طبعی تقاضا ہے، یہ غضب کہلاتا ہے۔ یہ بھی ہماری ایک ضرورت ہے۔ بھوک، پیاس، بول و براز کی ضرورت، کسل والم، نیند اور غلبۂ شہوت۔ یہ تمام نفس کے کام ہیں۔ یہ جو ایک تصویری خاکہ ہے، یہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا ماڈل ہے۔ انہوں نے اس کو اس طرح پیش کیا ہے۔ قلب ہے، عقل ہے، نفس ہے۔ bilateral دونوں ایک دوسرے کو متاثر (attract) کرتے ہیں۔ ان تمام چیزوں کو ہم اس طرح سمجھیں گے کہ عقل قلب کو متاثر کرتی ہے، قلب عقل کو متاثر کرتا ہے، قلب نفس کو متاثر کرتا ہے، نفس قلب کو متاثر کرتا ہے، عقل نفس کو متاثر کرتی ہے، نفس عقل کو متاثر کرتا ہے۔ لہٰذا اس کے لئے کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا ہو گا، کوئی ایسا step لینا ہو گا کہ خیر کی طرف یہ نظام چل پڑے۔ چنانچہ جیسے میں نے عرض کیا کہ قلب کے اندر ایمان بھی ہے، کفر بھی ہے، محبت بھی ہے، نفرت بھی

ہے، یہ ساری چیزیں دل میں ہیں۔ لہٰذا پہلے دل کے اندر ایمان کو لانا پڑے گا۔ جس کو ہم ایمان بالغیب کہتے ہیں۔ جیسے اللہ پاک نے سورۂ بقرہ کے بالکل پہلے رکوع میں تعارف کرایا ہے: ﴿الٓمّٓ O ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ O الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ O وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ O اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾(البقرۃ:1-5)

ترجمہ: ''الم۔ یہ کتاب ایسی ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں، یہ ہدایت ہے ان ڈر رکھنے والوں کے لئے، جو بے دیکھی چیزوں پر ایمان لاتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا، اس میں سے (اللہ کی خوشنودی کے کاموں میں) خرچ کرتے ہیں۔ اور جو اس (وحی) پر بھی ایمان لاتے ہیں، جو آپ پر اتاری گئی اور اس پر بھی جو آپ سے پہلے اتاری گئی اور آخرت پر وہ مکمل یقین رکھتے ہیں۔ یہ ہیں وہ لوگ جو اپنے پروردگار کی طرف سے صحیح راستے پر ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں، جو فلاح پانے والے ہیں''۔

سب سے پہلے ایمان بالغیب سے بات شروع ہوئی کہ اگر کسی کو ایمان بالغیب حاصل نہیں، تو قرآن اس کو ہدایت نہیں دیتا۔ لہٰذا اگر میرے دل میں ایمان ہے، تو میرا Yes اور No تبدیل ہو جائے گا۔ میری پسند اور ناپسند تبدیل ہو جائے گی، یہ ساری چیزیں بالکل بدل جائیں گی۔ لہٰذا ایمان کی روشنی سے پہلے عقل کے ذریعے سے دل کو قائل کر لو کہ وہ ایمان قبول کرے۔ پھر جب دل

ایمان قبول کرلے، تو عقل کو اس کی روشنی سے منور کرو، تاکہ اب وہ ایمانی عقل بن جائے، نفسانی عقل نہ رہے۔ ایمانی عقل یہ ہے کہ شریعت نے جو چیز روکی ہے، ہمارا ایمان بالغیب کہے کہ یہی ہمارے لئے صحیح ہے، اب اس کی طرف میں نہ جاؤں۔ لہٰذا میں اپنی عقل کو اس کی طرف نہ مصروف کروں، بلکہ اس چیز کی طرف مصروف کروں، جس کی شریعت اجازت دیتی ہے۔ مثلاً: نقل کے ذریعے سے میں پاس ہونا چاہتا ہوں، تو شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ اب عقل ادھر بھی چلتی ہے۔ جیسے کہتے ہیں کہ نقل بھی عقل کے ساتھ ہوتی ہے۔ کیونکہ پتا نہیں، کتنے لوگ بوٹیاں بناتے ہیں، کیا کیا طریقے سیکھتے ہیں اور بڑی عقل مندی کے ساتھ نقل کرتے ہیں، تو عقل ادھر بھی استعمال ہو رہی ہے، لیکن اس کی شریعت اجازت نہیں دے رہی۔ شریعت بتا رہی ہے کہ تم پڑھو اور پڑھنے میں جو آپ عقل استعمال کر سکتے ہو، وہ استعمال کرو۔ کیونکہ کوئی بیوقوفی کے ساتھ پڑھتا ہے، کوئی عقل مندی کے ساتھ پڑھتا ہے۔ عقل مندی کے ساتھ پڑھنے سے نتیجہ زیادہ بہتر ہو گا۔ بیوقوفی کے ساتھ پڑھنے سے وہ نتیجہ نہیں حاصل ہو گا۔ مثلاً: جب میں اسلامیہ کالج میں میں تھا، تو وہاں ہمارے ایک کلاس فیلو تھے جو بہت زیادہ پڑھتے تھے، لیکن ان کی Third division آتی تھی۔ ایک دن ہم ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، تو ان سے ہم نے کہا کہ آپ کے ساتھ ایسا کیوں ہے؟ پڑھتے تو آپ ہم سے زیادہ ہیں، نمبر آپ کے کم آتے ہیں، کیا وجہ ہے؟ اس بات چیت سے ہمیں پتا چلا کہ وہ مجاہدہ بہت کرتے ہیں، پڑھتے بہت ہیں، لیکن ان کو اتنی نیند آتی ہے کہ ان کو الفاظ سمجھ نہیں آتے، صرف پڑھ ہی رہے ہوتے ہیں۔ حالانکہ صرف پڑھنا تو مقصود نہیں ہے، وقت پہ آرام کرنا، باقی تمام چیزوں کا انتظام کرنا بھی ضروری ہے۔ اگر پابندی کے ساتھ پڑھا جائے،

تو تھوڑا پڑھنا زیادہ مفید ہو جاتا ہے۔ یہ بات ذرا لمبی ہو جائے گی۔ اس کے متعلق میرے پاس بہت سے قصے ہیں۔ لیکن میں اصل بات پوری کرتا ہوں کہ ایمان بالغیب کی روشنی میں شریعت کے مطابق جو چیز جائز ہے، اس کے لئے عقل استعمال کرنا اور جو چیز ناجائز ہے، اس کے لئے عقل استعمال نہ کرنا، یہ طریقہ وہاں شروع ہو جائے گا۔ یہاں تک تو بات واضح ہو گئی، یعنی عقل اور قلب نے آپس میں دوستی کر لی، لہٰذا کچھ نہ کچھ کام بن جائے گا۔ لیکن یہ دوستی زیادہ کارآمد نہیں ہوتی، ابھی آگے بھی کچھ کرنا ہے۔ دراصل نفس باغی ہے، یہ نہیں مانتا، بے شک آپ کا دل مطمئن ہے، آپ کی عقل یہ کہتی ہے، لیکن نفس نہیں مانتا۔ جیسے شوگر کے مریض کی مثال لے لیں، شوگر کی بیماری زیادہ تر بڑی عمر میں ہوتی ہے، چھوٹی عمر میں کم ہی ہوتی ہے۔ چنانچہ اس عمر میں لوگوں کو عقل پوری ہوتی ہے، وہ دوسروں کو عقل سکھاتے ہیں۔ ان کو ڈاکٹر نے کہا ہوتا ہے کہ اگر آپ نے میٹھا نہیں بند کیا، تو ممکن ہے کہ آپ کے گردوں کو نقصان پہنچے، ممکن ہے کہ آپ کے دل کو نقصان پہنچے، ممکن ہے کہ آپ کے دماغ پہ اس کا اثر پڑ جائے، یا اس طرح کا کوئی مسئلہ ہو جائے۔ یہ ساری باتیں وہ جانتے ہیں، لیکن جس وقت میٹھا ان کے سامنے آ جاتا ہے، تو کھا لیتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست ہیں، جو ڈاکٹر ہیں، ان کو بھی شوگر کی بیماری تھی۔ ہمارے گھر تشریف لائے تھے، ان کی بیٹیاں بھی ساتھ تھیں۔ گھر والوں نے ان سے پوچھا کہ ان کو شوگر ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں! شوگر ہے۔ پوچھا: چینی والی چائے پیتے ہیں؟ کہا: پیتے ہیں۔ گھر والوں نے کہا: شوگر ہے، تو پھر نہیں پینی چاہئے۔ کہنے لگیں: ہم تو ہمیشہ ان کو منع کرتی ہیں، لیکن وہ کہتے ہیں کہ چینی کون کھائے گا۔ حالانکہ ان کو نہیں کھانی چاہئے، لیکن وہ کھاتے ہیں۔ اس سے پتا چلا کہ نفس اگر نہ مانے، تو آپ کی عقل کی

بات اور آپ کے قلب کی بات دھری کی دھری رہ جائے گی۔ لہٰذا نفس کی اصلاح بھی کرنی چاہئے۔ نفس کی اصلاح کیسے ہوتی ہے؟ تو ہر چیز کی اپنی اصلاح ہے۔ قلب کی اصلاح حدیث شریف کے مطابق ذکر اللہ سے ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہر چیز کے لئے ایک سقالہ (مانجھنے کا آلہ) ہے اور دلوں کے لئے سقالہ ذکر اللہ ہے''۔ لہٰذا اگر آپ ذکر کرتے ہیں، تو ذکر سے آپ کا دل اچھا ہو گا۔ لیکن ذکر بھی عقل مندی کے ساتھ کریں گے، اپنی مرضی سے نہیں کریں گے۔ کسی شیخ سے پوچھیں گے، وہ آپ کو بتائے گا اور اس طریقے سے ذکر کریں گے، تو پھر آپ کی اصلاح ہو گی۔ ورنہ مقصد حاصل نہیں ہو گا۔ بہر حال! ذکر اللہ سے دل صاف ہو جاتا ہے۔ اور عقل فکر کے ذریعے سے ٹھیک ہوتی ہے۔ کیونکہ ذکر تو پہلے سے ہی دل کے لئے ہے ہی، اور فکر مزید اس کے علاوہ (In addition) ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ O الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ (آل عمران:190-191)

ترجمہ: ''بیشک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات دن کے باری باری آنے جانے میں ان عقل والوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں، جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹے ہوئے (یعنی ہر حال میں) اللہ کو یاد کرتے ہیں، اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق پر غور کرتے ہیں، (اور انہیں دیکھ کر بول اٹھتے ہیں کہ) اے ہمارے پروردگار! آپ نے یہ سب کچھ بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ آپ (ایسے فضول کام سے)

پاک ہیں، پس ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالیجئے"۔

چنانچہ عقل فکر کے ذریعے سے درست ہوتی ہے۔ اور نفس مجاہدے سے درست ہوتا ہے۔ نفس کی نہ مانو۔ اللہ پاک نے اس نفس کا بڑا عجیب ڈھانچہ (structure) بنایا ہے۔ اس کی یہ خاصیت ہے کہ اگر آپ اس کی بات مانیں گے، تو یہ مزید مطالبہ کرے گا۔ ایک سٹیج ایسا آسکتا ہے کہ یہ بگاڑ (perversion) کی حد تک چلا جائے۔ پھر یہ پاگل پن کے نمونے پیش کرے گا۔ لیکن اگر آپ اس کو دبائیں، تو دب بھی جاتا ہے۔ مثلاً: اگر پہلے یہ 100٪ زور سے بولتا ہے کہ مجھے یہ چیز دو اور آپ کہتے ہیں کہ میں نہیں دیتا اور آپ اس پر قائم رہے اور نہیں دی، تو اگلی دفعہ وہ 100 یونٹ کے ساتھ آواز نہیں کر سکے گا۔ بلکہ اس سے تھوڑا سا کم 99 یونٹ سے کہے گا کہ مجھے یہ چیز دو۔ اگر پھر آپ نہیں دیں گے، تو اور کم ہو جائے گا۔ پھر آپ نہیں دیتے، تو پھر مزید کم طاقت کے ساتھ کہے گا۔ یوں مسلسل کم ہوتا جائے گا۔ حتیٰ کہ ایک سٹیج آجائے گی کہ بالکل ہی مریل ہو جائے گا۔ بالآخر ماننا شروع کر لیتا ہے۔ یہ ہے نفسِ مطمئنہ۔ لیکن اس کا علاج نہ ماننے میں ہے۔ جیسے روزے میں بھی مجاہدہ ہے اور روزہ تقویٰ کا ذریعہ ہے۔ جیسے نفس کے لئے اللہ پاک نے فرمایا ہے:

﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا O فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا﴾ (الشمس:7-8)

ترجمہ: "اور انسانی جان کی، اور اس کی جس نے اسے سنوارا۔ پھر اس کے دل میں وہ بات بھی ڈال دی، جو اس کے لئے بدکاری کی ہے، اور وہ بھی جو اس کے لئے پرہیز گاری کی ہے"۔

گویا نفس کے اندر فجور کے تقاضے بھی ہیں اور تقویٰ بھی ہے۔ چنانچہ فجور کے تقاضے کو دبانے کا

نام تقویٰ ہے۔ اور روزے کے لئے فرمایا: ﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾(البقرہ:183)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کر دیئے گئے ہیں، جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے، تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو''۔

گویا جو نفس پہ پیر رکھے گا، اس کو تقویٰ حاصل ہو گا۔ اور یہ مجاہدہ ہی ہے۔ لہٰذا ہمیں نفس کی اصلاح کے لئے مجاہدہ کرنا پڑے گا۔ اور مجاہدہ بھی ہوشیاری کے ساتھ کرنا پڑے گا، اپنے طور پہ نہیں کرنا۔ بلکہ اس کو باقاعدہ technique کے ساتھ کرنا ہے۔ میں آپ کو ایک مثال دیتا ہوں۔ ہمارے پاس نوجوان نوجوان لوگ آجاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شاہ صاحب! کیا کریں، آنکھ اٹھ ہی جاتی ہے۔ ان کے لئے میں نے ایک مجاہدہ بنایا ہے کہ اس طرح کرو کہ تنہائی میں بیٹھ کر پانچ منٹ نیچے دیکھنا ہے، چاہے کچھ بھی ہو، آپ نے اس دوران نیچے دیکھنا ہے۔ پھر اگلے دن چھ منٹ، اس سے اگلے دن سات منٹ، اگلے دن آٹھ منٹ، اگلے دن نو منٹ، اس کو پچیس منٹ تک پہنچانا ہے جو کہ بیس دن میں پہنچ جائے گا۔ پھر اس کے بعد باہر آکر لوگوں کے درمیان بیٹھ کر اوپر نہیں دیکھنا، نیچے دیکھنا ہے۔ ان کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے بھی نیچے دیکھنا ہے۔ پہلے دن پانچ منٹ، اگلے دن چھ منٹ، پھر اگلے دن سات منٹ، اگلے دن آٹھ منٹ، اور اس کو بھی پچیس منٹ تک پہنچانا ہے۔ یہ بھی بیس دن ہو گئے۔ یوں الحمدللہ ایک چلے میں آپ کو اپنی آنکھ پر پچیس منٹ قابو رکھنے کی صلاحیت حاصل ہو گئی۔ پچیس منٹ بڑی چیز ہے، کیونکہ اگر آپ کسی وقت بھی خطرہ میں ہوں، تو

پچیس منٹ میں ادھر ادھر ہو سکتے ہیں۔ گویا نظر کی حفاظت ہو گئی۔ اب اس میں صرف دو چیزیں ہیں: ایک ہے نفس کی نہ ماننا، دوسرا ہے تدریج سے نہ ماننا۔ یہ کام فوراً نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اگر میں آپ کو فوراً پچیس منٹ کا کہتا، تو نہ ہوتا۔ جیسے جمناسٹک والے جب جمناسٹک سیکھ لیتے ہیں، تو کیسے عجیب عجیب کام کرتے ہیں، لیکن کیا انہوں نے ایک دن میں حاصل کئے ہوتے ہیں؟ ایک دن میں حاصل نہیں کئے ہوتے، بلکہ اس کو بہت ہی آہستہ آہستہ (gradually) وہ اس حالت تک پہنچاتے ہیں۔ گویا نفس کو بتدریج مجاہدہ کے ذریعے سے آپ نے سدھانا (tame) کرنا ہے۔ اسی کو سدھارنا کہتے ہیں۔ اگر آپ نے نفس کو اس طریقے سے سُدھا (tame کر) لیا، تو ایک وقت آ جائے گا کہ یہ بالکل آپ کی بات مانے گا۔ اس کے لئے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے جو ارشادات فرمائے وہ بھی میں کچھ عرض کرتا ہوں۔

لطائف کے باہمی تعامل کے بارے میں تو بات ہو گئی ہے، یہ ذات میں مستقل ہیں، لیکن باقیوں سے متاثر ہیں، اگر دل درست ہے، تو جسم درست ہے، اگر نفس پاک ہے، تو مکمل کامیابی حاصل ہو جائے گی اور جو عقل مند ہے، وہی دین دار ہے۔ یہ بات حدیث شریف کی روشنی میں لی ہے۔

اب ذرا نظامِ تربیت کو دیکھ لیں، اس کا تجزیہ (analysis) کر لیں۔ کارآمد ترتیب کیا ہو سکتی ہے؟ قلب و عقل نفس کے تابع ہوں، تو تباہی ہے۔ عقل اور نفس اگر قلب کے تابع ہو جائیں، تو بظاہر لوگ کہتے ہیں کہ یہ تو بڑا اچھا کام ہے، قلب تو بادشاہ ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے، قلب میں جذبات ہوتے ہیں اور جس کے اوپر جذبات حکمران ہوتے ہیں، وہ کیسے ہوتا ہے؟ جذباتی سوچ اچھی

نہیں ہوتی۔ لہٰذا قلب کو حاکم نہیں بنا سکتے۔ اسی طرح اگر نفس اور قلب عقل کے تابع ہوں، تو بظاہر یہ چیز بہت زبردست لگتی ہے کہ مسئلہ حل ہو گیا۔ لیکن کون سی عقل، ایمانی عقل یا نفسانی عقل؟ نفسانی عقل ہو گی، تو بھی مسئلہ حل نہیں ہو گا۔ کیونکہ ہم جو بڑے بڑے لوگوں کو دیکھتے ہیں، جو پوزیشن (رتبے) کے لحاظ سے بہت بڑے ہوتے ہیں، لیکن بعض دفعہ اخلاقی بیماریوں کے لحاظ سے بہت گری ہوئی حرکتیں کرتے ہیں۔ حالانکہ ان میں عقل کی کمی نہیں ہوتی، لیکن ان کی عقل عقلِ نفسانی ہوتی ہے۔ گویا مسئلہ بدستور موجود ہے۔ اس کو حل کرنے کے لئے ہمیں وہی طریقہ اختیار کرنا پڑے گا کہ پہلے ایمان بالغیب کے ذریعے سے عقل کو قائل (convince) کرنا پڑے گا، پھر دل پر محنت کر کے اس کو ایمان دار بنانا ہو گا، جب ایمان دار بن جائیں، تو عقل کو اس کا تابع کرنا پڑے گا، پھر دل کے ذریعے سے نفس کو قابو کیا جائے گا۔

لطیفۂ عقل کو متاثر کرنے والے عوامل: ذکر، مراقبہ، معلومات، اخبارات، تجربات، ایمان بالغیب اور ان کی تفصیلات اور لطیفۂ سر کی کیفیت (جو ان شاء اللہ تھوڑی دیر بعد بتاؤں گا۔) پھر لطیفۂ عقل کے اثرات یاداشت پر پڑتے ہیں، سوچ پر پڑتے ہیں، لطیفۂ قلب و نفس کی حالت پر اور فکر پر پڑتے ہیں۔

قلب کو متاثر کرنے والے عوامل: القاءِ رحمانی، القاءِ شیطانی، حواسِ خمسہ، نفسانی خواہشات، عقلی دلائل، استنباطات اور لطیفۂ روح؛ یہ سب چیزیں قلب کو متاثر کرتی ہیں۔ قلب کے اثرات یہ ہیں کہ اگر دل پہ محنت کریں اور یہ صاف ہو، تو حواسِ خمسہ صحیح استعمال ہوں گے، جذبات و کیفیات میں توازن (balance) آئے گا، عقل اور نفس کی حالت بہتر ہو جائے گی۔

نفس کو متاثر کرنے والے عوامل: مجاہدات و ریاضات یا نفس کی مخالفت، لذات و خواہشات کا اتباع، لطیفۂ قلب و عقل کی حالت کا نفس پر اثر۔ نفس کے اثرات یہ ہیں: لذات و خواہشات و ضروریاتِ بدن کے لئے طلب، لطیفۂ قلب و عقل کے حالات پر اثرات۔

اب آگے میں نتیجہ اخذ (conclude) کر رہا ہوں۔

عقل کی تہذیب: یعنی عقل کو کیسے مہذب بنایا جاتا ہے؟ اس کے لئے ذکر و فکر کا مجموعی اثر اس پہ ڈالنا ہوتا ہے۔ ذکر تو دل کے لئے بھی ہے، اگر ساتھ فکر کو بھی ملا دیں، تو یہ عقل کے لئے ذریعہ بن جائے۔ کیونکہ فکر کے بارے میں اللہ پاک نے کئی جگہوں پہ فرمایا ہے۔ ایک جگہ ہے: ﴿لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ (یوسف:2) کہیں پر فرمایا: ﴿اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ﴾ (الانعام:50) کہیں پر ہے: ﴿اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ﴾ (الذّٰریٰت:21) یہ ساری آیات ہمیں فکر کی دعوت دے رہی ہیں۔

عقل کی تہذیب کے باعث اشکالات کا دور ہونا، شک کا یقین میں بدل جانا، چنانچہ یہ جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ﴾ (البقرہ:4) یہ بھی عقل کا فعل ہے۔ یعنی اگر آخرت پہ یقین ہو گا، تو عقل صحیح ہو گی اور اگر عقل صحیح ہو گی، تو آخرت پہ یقین کرے گی۔ گویا یہ بھی باہمی (bilateral) ہے۔ اور اگر آخرت پہ یقین نہیں ہو گا، تو اس کی ساری چیزیں دنیا کے لئے ہو جائیں گی، وہ selfish ہو جائے گا۔

شک کا یقین میں بدل جانا، آخرت پر یقین، آخرت کے لئے کام میں معاون، جذباتیت کی بجائے عقلیت سے کام لینا، دل کا عقل کی رہنمائی میں اپنا جذبہ شامل کر کے نفس کو کام پر آمادہ کرنا۔

عقل کی تہذیب کے اثرات یہ ہیں: معرفت کا حاصل ہونا، یقین کا حصول، شک کا دفع ہونا، سر کے ساتھ رابطہ ہو جانا، اس کے رنگ میں رنگ جانا، خود بلا دلیل حق کا قائل ہونا اور دوسروں تک حق پہنچنے میں دلائل کو بنیاد بنانا۔

یہاں سر اور روح کے الفاظ بار بار آرہے ہیں، جو آپ کو ذرا تشنہ لگ رہے ہیں۔ ان کے بارے میں کچھ عرض کر دوں۔ اصل میں عقل، نفس اور قلب، جب یہ تین چیزیں متوازن (balance) ہو جاتی ہیں تب جا کر کامیابی حاصل ہو جاتی ہے۔ دراصل حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی فرمایا تھا کہ ہماری روح عاشق تھی، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿**اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى**﴾ (الاعراف:172)

ترجمہ: ''(اور پوچھا کہ) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا تھا کہ: کیوں نہیں؟''۔

لیکن جب یہ نفس میں آگئی، تو یہ غلام بن گئی، یعنی نفس نے اس کو دبوچ لیا۔ اس کو نفس سے چھڑانا ہے، تاکہ آزاد ہو جائے اور آزادی کے ساتھ کام کر سکے۔ اور اس کے لئے ذکر کرنا پڑے گا، تاکہ اس کو اللہ یاد آجائے۔ یعنی اس کو اپنی پرانی حالت یاد آجائے کہ میں تو اللہ تعالیٰ کی عاشق تھی اور ذکر کے ذریعے سے اس میں یہ طلب پیدا ہو جائے کہ میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ ملوں۔ اور جب اس کی یہ طلب بڑھ جائے گی، تو پھر یہ پھڑ پھڑانا شروع کرے گی کہ میں نفس سے آزاد ہو جاؤں۔ لیکن نفس اس کو چھوڑے گا نہیں۔ اس لئے فرماتے ہیں کہ پھر نفس کے ہاتھ پیر باندھنے پڑیں گے، تاکہ

یہ یہاں سے چھوٹ جائے۔ ہاتھ پیر باندھنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنی آنکھوں پہ کنٹرول، اپنے کانوں پہ کنٹرول، اپنی زبان پہ کنٹرول، اپنے دماغ پہ کنٹرول اور ہاتھ پاؤں پہ کنٹرول ہو۔ ان سب پہ جب ہم کنٹرول کریں گے، تو گویا ہم نے نفس کے ہاتھ پیر باندھ لئے۔ لہٰذا جب ہم مجاہدہ کریں گے، تو روح وہاں سے آزاد ہو جائے گی۔ اور جب قید خانہ سے کوئی قیدی آزاد ہوتا ہے، تو پھر اپنے گھر جاتا ہے۔ اسی طرح روح بھی اپنے گھر جاتی ہے اور ملاءِ اعلیٰ پہنچتی ہے۔ جب ملاءِ اعلیٰ پہنچتی ہے، تو قلب اس کا Eye piece (آئی پیس) بن جاتا ہے اور قلب کے ذریعے سے ملاءِ اعلیٰ کے حالات اس کے اوپر کھلنا شروع ہو جاتے ہیں، جس سے معرفت کے راستے کھل جاتے ہیں۔ الہامات شروع ہو جاتے ہیں اور ایسی ایسی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں، جو کتابوں میں نہیں لکھی ہوتیں۔

حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے اسی چیز کو بیان فرمایا ہے:

بینی اندر خود علومِ انبیاء
بے کتاب و بے معید و اوستا

یعنی اپنے اندر علومِ انبیاء کو دیکھو گے، نہ کسی مدرسہ کے باعث، نہ کسی کتاب کے باعث، نہ کسی استاد کے باعث، بلکہ براہِ راست اللہ تعالیٰ آپ کو نصیب فرمائیں گے۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم ہو جاتا ہے، تو یہ چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔ اور اسی کیفیت کو لطیفۂ روح کا بیدار ہونا کہتے ہیں۔ اور اس کے بعد پھر لطیفۂ سر بھی بیدار ہو جاتا ہے۔ لطیفۂ سر کیا چیز ہے؟ وہ عقل کی promotion ہے، یعنی پہلے عقل سوچتی تھی دنیا کے ذریعے سے، اب عقل سوچ رہی ہے ملاءِ اعلیٰ کے ذریعے سے۔ اسی کو سر کہتے ہیں۔ اللہ والوں کے اوپر عالی مضامین کا جو ورود ہوتا ہے، یہ

سر کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ جیسے مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اوپر مکتوبات شریفہ کا یا دوسرے اکابر پر عالی مضامین کا ورود ہوا ہے، یہ ماشاءاللہ سر کے ذریعے سے ہوا ہے۔ تو یہ دو لطیفے ہیں۔

قلب کی تہذیب: قلب جذبات، احساسات، ایمان و کفر کی جگہ ہے۔ ایمان کی صورت میں ایمانی احساسات، کفر کی صورت میں کافرانہ احساسات۔ اب اس میں ہم نے کیا کرنا ہے؟ پہلی بات یہ ہے کہ ہم ایمان کو حاصل کریں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ عاجلہ کی محبت کو آجلہ سے بدلنے کی تدبیر کریں گے۔ عاجلہ کا معنیٰ ہے: فوری چیز۔ کیونکہ انسان کی فطرت میں یہ ہے کہ وہ عاجلہ کی طرف جاتا ہے: ﴿كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ O وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ﴾ (القیامۃ:20-21)

ترجمہ: ''خبر دار (اے کافرو!) اصل بات یہ ہے کہ تم فوری طور پر حاصل ہونے والی چیز (یعنی دنیا) سے محبت کرتے ہو۔ اور آخرت کو نظر انداز کئے ہوئے ہو''۔

چنانچہ اللہ جل شانہٗ اگر آپ کی عقل کو رسائی دے دیں، تو یہ وہاں کے حالات کو دیکھے گی کہ وہاں کون سی چیز چاہئے اور کون سی چیز نہیں چاہئے اور وہاں کون سی چیز سے بچنا چاہئے۔ اور اس کے لئے جس بندوبست کی ضرورت ہے، جب وہ شروع ہو جاتا ہے، تو یہ عاجلہ کو آجلہ سے بدلنے کی ترتیب ہے۔ یعنی پہلے میں صرف دنیا کے لئے سوچ رہا تھا، پھر میں دنیا اور دین دونوں کے لئے سوچ رہا ہوں گا۔ تیسری بات یہ ہے کہ دنیا کی بے ثباتی کو تذکیر کے ذریعے سے دل میں پہنچانا۔ یہ جو تبلیغی جماعت کے حضرات بیانات کرتے ہیں، یہ تذکیر ہی ہے۔ بار بار جو کہتے ہیں، اسی سے دلوں میں باتیں بیٹھ جاتی ہیں۔

قلب کی تہذیب کے آثار: حبِ الٰہی، ایمان، تقویٰ، صدق، ادب، حیا، وجد، شرمندگی، شوق،

ندامت اور پشیمانی، خود بخود اپنے اوپر پیش وتاب کھانا، نفسِ شہوانی پر غلبہ حاصل کرنا۔

تہذیبِ نفس: قوتِ ملکیہ کا قوتِ ناسوتیہ پر تصرف۔ (انسان کے اندر جو روحانیت ہے، یہ قوتِ ملکیہ ہے۔ اور ہمارے اندر جو حیوانیت ہے، یہ قوتِ ناسوتیہ ہے۔) تاکہ قوتِ ملکیہ کے احکام نافذ ہوں اور قوتِ بہیمیہ کے آثار کم ہو جائیں۔ یعنی شریعت جبلّت پر غالب ہو جائے۔

تہذیبِ نفس کے چار ذرائع: اب میں مزید تفصیل میں نہیں جانا چاہتا، کیونکہ میرے خیال میں آپ حضرات کے لئے اتنا کافی ہے۔ ویسے یہ مضمون بڑا لمبا ہے۔ کیونکہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیقات کا نچوڑ ہے۔

اس کو کسی اور وقت پہ رکھ لیتے ہیں۔ اگر یہ بات سمجھ میں آگئی ہے، تو اس سے متعلق اگر کوئی سوال ہو، تو بے شک کر لیں۔

سوال:

جب سے میں نے یہ ٹاپک دیکھا، تو میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ آپ سے سوال کر لوں۔ ٹاپک ہے: ''نظامِ تصوف سے گزری ہوئی شخصیت معاشرے کے لئے عملی نمونہ ہے۔'' جب کہ حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہی بہترین عملی نمونہ ہیں۔ اس لئے میرے خیال میں تصوف والا خانقاہی نظام ایک متوازی نظام ہے۔

اسلام میں توحید، نبوت اور شریعت؛ یہ تین چیزیں ہیں۔ جب کہ تصوف اور اہلِ تصوف صرف توحید کے گرد گھومتے ہیں جو کہ Stated point ہے۔

علامہ اقبال کا ایک شعر ہے:

صوفیٔ طریقت میں فقط مستیِ احوال
مُلّا کو شریعت میں فقط مستیِ گفتار

صوفیاء حضرات وحی، الہام اور مشاہدہ پر یقین رکھتے ہیں، جب کہ قرآن کی رو سے نبوت آپ ﷺ پہ ختم ہو گئی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اب کسی الہام یا مشاہدۂ غیب کا کوئی کام نہیں ہے۔ اور ارشادِ نبوی ہے کہ نبوت سے مُبشّرات (یعنی اچھے خواب) باقی رہ گئے ہیں۔ جب کہ اہلِ تصوف کے یقین میں یہ سب چیزیں ابھی بھی حاصل ہو سکتی ہیں۔ جیسے: فرشتے اب بھی اترتے ہیں اور عالمِ غیب کا مشاہدہ اب بھی بہت ہوتا ہے اور اکابرین اب بھی ہدایت وہیں سے پاتے ہیں، جہاں سے جبرائیلِ امین پاتے ہیں۔ تو میں تھوڑی سی امام غزالی اور شاہ ولی اللہ اور شاہ اسماعیل شہید، شیخ احمد رحمۃ اللہ علیہم کی کتابیں اور داتا گنج بخش کی کشف المحجوب اور خواجہ بایزید بسطامی کی کچھ چیزیں پڑھی ہیں، تو میں بہت ہی حیرت میں پڑ گیا۔ جیسے خواجہ بایزید بسطامی لکھتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ مجھے فلکِ اسفل میں لے گئے۔ ساری زمینیں اور پاتال تک دکھائے۔ پھر آسمان اور ان میں بہشت کے باغوں سے لے کر عرشِ بریں تک جو کچھ ہے، سب دکھایا۔ اس کے بعد اپنے سامنے کھڑا کیا اور فرمایا: ''مانگو، جو کچھ تم نے دیکھا ہے، میں تمہیں دوں گا''۔ میں confuse تھا کہ کس طرح سے صوفیت میں، تصوف میں پورا focus کیا جائے۔ جب کہ آپ کی ساری چیزیں قرآن اور حدیث کے مطابق ہیں کہ معاشرہ، شخصیت اور انسانیت، کہ کس طرح زندگی گزاری جا سکتی ہے۔ اور صرف تصوف اور خانقاہ میں گوشہ نشین ہو کر اور ''**آللہ، آللہ**'' کر کے اس پر سارے دروازے کھل جائیں! میں اس میں (الجھا ہوا) confuse ہوں۔

جواب:

جزاک اللہ۔ اصل میں یہ observations ہیں، ہر ایک کی اپنی اپنی observations ہوتی ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ ہر ایک کو اپنا (نقطۂ نظر) Point of view پیش کرنے کا حق بھی ہے۔ البتہ ایک بات میں آپ سے عرض کروں گا کہ تجزیے (analysis) کے دو طریقے ہیں۔ ہمارے جتنے بھی مشاہیر ہیں، جن سے ہم نے شریعت کا علم بھی سیکھا ہے، وہ اسی تصوف سے گزرے ہیں۔ کسی ایک کا نام کوئی بتادے کہ وہ تصوف سے نہ گزرے ہوں اور اس مقام پہ پہنچے ہوں۔ چنانچہ جتنے بھی ہمارے مشاہیر ہیں، جن کو ہم بڑا سمجھتے ہیں کہ یہ بہت بڑے علماء ہیں۔ گویا علم کی بھی صحیح بنیاد تصوف ہے۔ البتہ میں ایک بات عرض کرتا ہوں کہ واقعتاً تصوف کے بارے میں لوگوں نے بہت کچھ غلط پیش کیا ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ لیکن جو تصوف ہم پیش کرتے ہیں، وہ شریعت کی بنیاد پر ہے۔ یعنی شریعت اصل ہے۔ بلکہ یوں سمجھ لیجئے کہ شریعت پر لانے کے لئے جو طریقہ (procedure) ہے، وہ طریقت ہے۔ مثلاً: ایک شخص شریعت پر عمل تو کرنا چاہتا ہے، لیکن اس کا نفس باغی ہے، وہ نہیں عمل کرنا چاہتا۔ اور اگر وہ اپنے نفس کو قید کرلے اور وہ شریعت پر عمل کرنا شروع کرلے، تو یقیناً آپ بھی اس کو اچھا سمجھیں گے، میں بھی اس کو اچھا سمجھوں گا، سب اس کو اچھا سمجھیں گے۔ اسی کو ہم طریقت کہتے ہیں۔ ہم کسی اور چیز کو طریقت نہیں کہتے۔ ممکن ہے کہ کچھ لوگوں نے دوسری چیزوں کو طریقت کہا ہو، اس کو چیستان بنادیا ہو۔ یعنی کچھ ایسی چیزیں پیش کیں، جن کا تصوف سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

آپ نے ابھی جو چند سوالات اٹھائے ہیں، ان میں آپ نے مبشرات کی بات کی ہے۔

مبشرات مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ مثلاً: خواب کے ذریعے سے بھی انسان کو پتا چل سکتا ہے، جیسے خواب میں انسان جنت میں بھی جا سکتا ہے۔ خواب میں اللہ تعالیٰ کا دیدار بھی ہو سکتا ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ عالم ہیں، صوفی کم مشہور ہیں، عالم زیادہ مشہور ہیں۔ اور امام بھی ان لوگوں کے ہیں، جو ان چیزوں کو نہیں مانتے۔ امام احمد بن حنبل کا حنبلی مسلک ہے اور سعودی عرب سارا حنبلی ہے۔ حالانکہ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ مجھے سو دفعہ اللہ تعالیٰ کا خواب میں دیدار ہوا۔ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ اللہ تعالیٰ سے میں نے پوچھا کہ یااللہ! تجھ تک پہنچنے کا آسان سے آسان راستہ کیا ہے؟ اللہ پاک نے فرمایا: قرآن پاک کی تلاوت۔ میں نے پوچھا: سمجھ کر یا بغیر سمجھے؟ اللہ پاک نے فرمایا: چاہے سمجھ کر ہو، چاہے بے سمجھے ہو۔ امام احمد بن حنبل کی ایک اور بات میں سناتا ہوں۔ امام احمد بن حنبل بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں جاتے تھے جو کہ صوفی تھے۔ ان کے بیٹے نے پوچھا کہ حضرت! بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ تو عالم بھی نہیں ہیں، آپ تو بہت بڑے عالم ہیں، امامِ وقت ہیں، آپ ان کی مجلس میں کیا کرنے جاتے ہیں؟ حضرت نے فرمایا کہ ہر ایک اپنے فائدے کے لئے کسی کے پاس جاتا ہے، میں ان کی مجلس میں اس لئے جاتا ہوں کہ مجھے اپنے علم پر عمل کی توفیق ہو جاتی ہے۔ کسی اور عالم نے ان سے یہی سوال کیا کہ آپ ان کے پاس کیا لینے جاتے ہیں؟ آپ تو خود امامِ وقت ہیں۔ فرمایا: میں عالم بالقرآن ہوں گا، وہ عارف باللہ ہیں۔ گویا ان تمام چیزوں کا آپس میں تعلق ہے۔ جیسے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے عالم تھے، لیکن ان کو پتا چلا کہ کچھ چیزوں کی کمی ہے، تو غائب ہو گئے۔ اور ایسے غائب ہوئے کہ چودہ سال غائب رہے۔ اور جب اس چیز کو حاصل کر کے واپس آئے، تو عجیب حالت ہو گئی۔ پہلے ان کے گھر میں بڑا پُر تعیُّش ماحول تھا، کیونکہ اس وقت

علماء کی بڑی قدر کی جاتی تھی۔ علماء کے گھروں میں صوفے، فانوس اور پتا نہیں، کیا کیا چیزیں ہوتی تھیں۔ لیکن جب آئے، تو فقیر امام غزالی بن گئے۔ حتیٰ کہ بادشاہوں کے ہاں بھی وہ فقیر کے طور پہ مشہور تھے۔ گویا یہ صرف ایک عملی ذوق ہے، صرف باتیں کرنا نہیں ہے۔

جیسے مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

قال را بگذار مرد حال شو
پیش مردِ کاملے پامال شو

ترجمہ: قال کو ایک طرف رکھ دو، مردِ حال بن جاؤ۔ اس کے لئے کسی مردِ کامل کے سامنے اپنے آپ کو پامال کر دو۔

جہاں تک علامہ اقبال کی بات ہے، تو میں صاف بات عرض کرتا ہوں کہ الحمد للہ علامہ اقبال کی شاعری ہمیں بہت پسند ہے اور ہمارے شیخ مولانا اشرف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کلامِ اقبال کے بہت سپیشلسٹ تھے۔ وقتاً فوقتاً کلامِ اقبال کو پڑھتے بھی تھے، لیکن علامہ اقبال کی زندگی کے کئی ادوار ہیں۔ جس دور میں وہ ان چیزوں کے منکر تھے، اس وقت کی شاعری کو اس کے لئے استعمال نہیں کریں گے۔ لیکن بعد میں وہ ان چیزوں کے قائل ہو گئے تھے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنے بارے میں کہتے ہیں کہ میں مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کا مریدِ ہندی ہوں۔ اور وہ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کو پیرِ رومی کہتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ سے روشنی لی، مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے علم لیا۔ اور پھر اس کے بعد کے جو ان کے اشعار ہیں، وہ یقیناً بہت قیمتی (valuable) ہیں۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو اس پر کام پہ لگایا ہوا ہے کہ کوشش کر کے علامہ اقبال کی وہ شاعری معلوم کریں، جو ان کی

آخری زندگی کی ہے۔ تاکہ ہمیں زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہو سکے۔ جزاک اللہ۔

سوال:

علامہ اقبال کہتے ہیں:

اچھّا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

جواب:

ماشاءاللہ! اصل میں یہ آپ نے علامہ اقبال کی ایک کیفیت بتائی ہے اور کیفیت آنی جانی ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کیفیت Subject to condition ہوتی ہے۔ جس condition میں انہوں نے یہ بات کہی ہے، اسی کے لئے valid ہے۔ جب وہ condition ختم ہو جائے، تو اس کے لئے وہ valid نہیں رہے گی۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ جذبات کو عقل کے ذریعے سے کنٹرول رکھو۔ یعنی عقل کا کام ہے کہ وہ جذبات کو کنٹرول کرے۔ یہ بات میں نے بھی عرض کی ہے کہ ایسا ہونا چاہئے۔ اور یہ جو کہا کہ کبھی کبھی اس کو تنہا بھی چھوڑ دو۔ اس کا مطلب ہے کہ ایمان کی حالت میں اس کو تنہا چھوڑو۔ کیونکہ اگر عقل ایمان کو نہیں مانتی، تو دل کی بات ماننی چاہئے۔

اسی عقل پر ایک چھوٹا سا کلام ہے، وہ آپ کو میں سناتا ہوں:

عقل والوں کی رسائی ذہن میں رکھتے ہوئے
عشق والوں کی رسائی پہ کوئی بات کرے

حسن والوں کی چاہتوں کو سامنے رکھ کر
خرد کی اپنی سست روی پہ کوئی بات کرے

حسن والے تو اتنا چاہیں اتنا عقل تو ہو
ساتھ یہ ہو تو وہ پہچانے تو سب میں جائیں

باقی پہچان کے بعد عشق سے ممکن جو ہے
اس کی فطری وارفتگی پہ کوئی بات کرے

اللہ جل شانہٗ نے فرمایا کہ میں نے کائنات کو اپنی پہچان کے لئے پیدا فرمایا ہے۔ ہر صلاحیت والا چاہتا ہے کہ اس کو پہچان لیا جائے۔ اور اللہ جل شانہٗ کی تو بات ہی اور ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کے لئے سارا کچھ پیدا کیا گیا ہے۔ اور پہچاننے کے لئے تو عقل کی ضرورت ہے، لیکن جب پہچان لیا جائے، تو پھر عقل کی حد ختم ہو جاتی ہے۔ پھر آگے عشق کی پرواز ہے کہ وہ کتنا آگے جا سکتا ہے۔

عقل جب عقل ہو تو عقل کو سیدھا رکھے
عشق جب عشق ہو تو ہو اصلی معشوق کے ساتھ

عقل جب نفس سے آلودہ ہو تو دل کی پھر
ہے جو ممکن اس میں کجی پہ کوئی بات کرے

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لب بام ابھی

کہتا اقبال ہے درست پر یہ عشق ملے کیسے؟
اس کے ملنے کی آگہی پہ کوئی بات کرے

عقل بن جائے اگر عشقِ حقیقی کا غلام
وہ خواہشاتِ نفسانی کا کرے ٹینٹوا بند

اس کی تائید ہو معشوقِ حقیقی سے پھر
دل کی الہامِ رحمانی پہ کوئی بات کرے

ایسا عاشق جب پہنچے اپنے معشوق کے ہاں
اور وہ معشوق ہو باوفا کا بنانے والا

ساتھ وہ معشوق ہو قادر کہ کرے جو بھی کرے
شبیرؔ اس کی مہمانی پہ کوئی بات کرے

اب اس کو میں conclude کرتا ہوں۔ بلکہ آخری شعر نے اس کو conclude کر ہی دیا ہے۔ جیسے قرآن پاک کی ایک آیت ہے:

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ O نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا

﴿تَدَّعُوْنَ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ﴾(حم السجدہ:30-32)

ترجمہ: ''جن لوگوں نے کہا ہے کہ ہمارا رب اللہ ہے، اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے، تو ان پر بیشک فرشتے (یہ کہتے ہوئے) اتریں گے کہ: نہ کوئی خوف دل میں لاؤ، نہ کسی بات کا غم کرو، اور اس جنت سے خوش ہو جاؤ، جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ ہم دنیا والی زندگی میں بھی تمہارے ساتھی تھے، اور آخرت میں بھی رہیں گے۔ اور اس جنت میں ہر وہ چیز تمہارے ہی لئے ہے جس کو تمہارا دل چاہے، اور اس میں ہر وہ چیز تمہارے ہی لئے ہے، جو تم منگوانا چاہو''۔

چنانچہ قرآن پاک میں اللہ پاک نے پہلے سے بشارت دی ہے کہ جو اس کے پاس بن کر آئیں گے، تو ان کو کہا جائے گا:

﴿وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ﴾ کہ تمہارے لئے ہر وہ چیز جنت میں موجود ہے، جو تمہارا جی چاہے گا اور ہر وہ چیز تمہیں ملے گی، جو تم منہ سے مانگو گے۔ کیونکہ یہ غفور ورحیم کی مہمانی ہے۔

بس اسی کے ساتھ محبت کرنی ہے، اسی کے لئے کام کرنا ہے، اسی کے لئے سوچنا ہے، اسی کے لئے زندہ رہنا ہے، اسی کے لئے مرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نصیب فرمادے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ O

تعلیماتِ مجدّدیہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ O

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ O

ہماری خانقاہ میں بدھ کے دن حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات شریفہ پر مشتمل معارف و تعلیمات کا درس ہوتا ہے۔ آج کے درس میں ایک خاص بات یہ ہے کہ ماہ ذی الحجہ شروع ہو چکا ہے اور ہمارے درس میں اِن ایام کی برکت بھی شامل ہو گئی ہے۔ حدیث شریف میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ جل شانہٗ کو جتنا عبادت کرنا ان ایام میں محبوب ہے، اتنا کسی اور دنوں میں نہیں ہے۔ ماہ ذی الحجہ کے ابتدائی دنوں یعنی یکم ذی الحجہ سے 8 ذی الحجہ تک روزے رکھنے میں ہر روزہ کا اجر ایک سال روزے رکھنے کے برابر ہے۔ 9 ذی الحجہ یعنی یوم عرفہ کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ میں گمان کرتا ہوں، اللہ پاک سے امید کرتا ہوں کہ اس ایک دن کا روزہ رکھنا ایک گزشتہ سال اور ایک آئندہ سال کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے۔ ایک روایت میں یہ ارشاد فرمایا کہ عشرۂ ذی الحجہ کے روزوں کا اجر ہزار دنوں کے روزوں جتنا ملتا ہے۔ یہ تقریباً پونے تین سال بن جاتے ہیں۔

عقل مند کے لئے اشارہ کافی ہوتا ہے جبکہ محرومیت کے لئے دلیل کی بھی ضرورت نہیں، بس سستی ہی کافی ہے۔ اِن ایام کے روزے رکھنا مستحب ہے، فرض و واجب نہیں ہے۔ لیکن مستحب ہی میں تو مسابقت ہے۔ فرائض و واجبات تو سب نے کرنے ہیں، ان میں کوئی کمی بیشی نہیں کر سکتا۔ البتہ مستحبات میں مسابقت ہوتی ہے۔ کوئی کسی ایک مستحب میں آگے جاتا ہے، کوئی دوسرے مستحب

میں آگے جاتا ہے۔اس معاملے میں میدان بڑا وسیع ہے۔

ہمارے اکابر رحمۃاللہ علیہم یہ نیکیاں بڑھ چڑھ کر کیا کرتے تھے۔امام ابو حنیفہ رحمۃاللہ علیہ کی تو خیر شان ہی الگ تھی کہ وہ بعض دفعہ عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھا کرتے تھے۔ بعض روایات کے مطابق ان کا مستقل طور پر یہ معمول تھا کہ فجر کی نماز عشاء کے وضو سے پڑھ لیتے تھے۔ امام شافعی رحمۃاللہ علیہ کے بارے میں بھی ایسی روایت آئی ہے۔امام احمد بن حنبل رحمۃاللہ علیہ کے بارے میں منقول ہے کہ روزانہ تین سو رکعت نفل پڑھا کرتے تھے۔ یہ تمام کاموں کے علاوہ عام دنوں کی بات ہے۔

اس سے پتا چلا کہ ان حضرات کو اللہ جل شانہٗ نے ان چیزوں کی قدر دانی اور معرفت نصیب فرمائی تھی۔ لہٰذا اُن سے اِن نیکیوں میں سستی نہیں ہوتی تھی۔آج کل معاملہ زیادہ مشکل ہے کیونکہ عمومی طور پر مستحب کو اس انداز میں لیا جاتا ہے کہ جیسے اس کی کوئی خاص اہمیت ہی نہیں ہے۔

دو چیزوں کو بالکل ہلکا لیا جاتا ہے: (1) ضعیف حدیث (2) مستحب امور۔ ضعیف حدیث کو لوگ موضوع تک پہنچا دیتے ہیں۔ حالانکہ ضعیف حدیث موضوع نہیں ہوتی۔ ضعیف حدیث میں صرف یہ ہوتا ہے کہ اس میں صحیح ہونے کی تمام شرائط نہیں پائی جاتیں۔اس لئے وہ سنداً صحیح نہیں رہ پاتی۔ بعض اوقات کسی حدیث کے کسی راوی میں کمزوری پائی جاتی ہے۔ راوی مجہول ہوتا ہے یا اس قسم کی کوئی اور بات ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے اس حدیث کی سند ضعیف قرار پاتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ حدیث موضوع کے درجے میں چلی گئی ہے اور بالکل قابلِ عمل ہی نہیں رہی۔ آپ اپنے عام دنیاوی معاملات میں دیکھیں۔ کتنے ہی لوگ ہیں جو مجہول روایتوں پہ عمل

کرتے ہیں۔ مثلاً راستہ میں جاتے ہوئے اگر کوئی کہہ دے کہ بھئی آگے گاڑی نہیں جاسکتی، رکاوٹ ہے۔ تو ہم بلاشک وشبہ اس کی بات پر عمل کرتے ہوئے راستہ تبدیل کر لیتے ہیں۔ حالانکہ اس کہنے والے کو ہم نہیں جانتے۔ پھر بھی اس کی بات پہ عمل کرتے ہیں۔ اگر دو آدمی کہہ دیں پھر تو بات مزید پختہ ہو جاتی ہے، اور تین آدمی کہہ دیں پھر تو ہر صورت میں واپس مڑنا ہو جاتا ہے۔

احادیثِ ضعیفہ کا بھی یہی معاملہ ہے۔ حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ ضعیف روایات میں یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ اگر مختلف طُرُق سے ایک ہی بات آجائے تو وہ بات مضبوط ہو جاتی ہے۔

آج کل چونکہ سستی غالب ہے، اس لئے مستحبات پر عمل نہ کرنے کے لئے بہانہ ڈھونڈا جاتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مستحب کو واجب بنادو۔ کیونکہ جو کسی مستحب کو واجب سمجھے گا اس کے لئے اس کا ترک واجب ہو جائے گا۔ لیکن بہر حال مستحب ہوتا تو کسی مقصد کے لئے ہی ہے۔ عمل کرنے کے لئے ہی ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ہم لوگوں کو اس کی قدر دانی کرنی چاہئے اور مستحب اعمال کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات میں بہت نور ہے۔ یہ حضرت کی فکر کی وجہ سے ہے۔ اللہ پاک اہل اللہ کی فکر کو محفوظ رکھتا ہے اور اس سے ان لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے جنہیں اہل اللہ کے ساتھ حسنِ ظن ہوتا ہے۔ جن لوگوں کو اہل اللہ کے ساتھ جتنا زیادہ حسنِ ظن ہوتا ہے انہیں اتنا زیادہ فائدہ پہنچتا ہے۔

کاملین پہ اعتراض کرنے کی ممانعت:

حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ دفتر اول مکتوب نمبر 101 میں ارشاد فرماتے ہیں:

متن:

جو خطاب آپ نے ظاہر طور پر نفس کی طرف کئے ہیں واضح ہوئے، ہاں نفس کی امارگی (سرکشی) کے زمانے میں اس پر اعتراض کریں وہ مسلم ہے لیکن (نفس کے) مطمئنہ ہو جانے کے بعد اُس پر اعتراض کرنے کی گنجائش نہیں ہے

تشریح:

یہ وہی عنوان ہے جس پہ گزشتہ ہفتے بات ہوئی تھی۔ اولیاء کرام کے گروہ سے محبت رکھنے اور ان کے بغض سے بچنے کی ترغیب۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو بیک وقت دو محاذوں پر مقابلہ در پیش تھا۔ ایک یہ کہ جن لوگوں نے تصوف کو بگاڑ دیا تھا، ان کی سرزنش کرنا اور ان کے جال سے لوگوں کو نکالنا۔ یہ حضرت کا شعبہ تھا۔ دوسری طرف جو لوگ اللہ والوں کے بارے میں گستاخی اور بدگمانی کیا کرتے تھے۔ مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا رد بھی ایسے عجیب و غریب انداز سے کیا کہ آدمی حیران ہو جاتا ہے۔

مثلاً حضرت شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ کے تصورِ وحدۃ الوجود کے معارف پر اگر کسی نے سب سے زیادہ تنقید فرمائی ہے تو وہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ اس کے باوجود ان کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ میں جب بھی کشف کی نگاہ سے دیکھتا ہوں تو انہیں (شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ کو) جنت کے اعلیٰ درجہ میں پاتا ہوں۔

اِس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ کے وقت میں اُس چیز کی ضرورت تھی اور

اِس وقت اِس چیز کی ضرورت ہے۔اُن کی نیت میں تو مسئلہ نہیں تھا۔ بلکہ لوگوں نے مسئلے کو بگاڑ دیا ہے۔ جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں عیسائیوں نے اپنا عقیدہ بگاڑ لیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے عیسائیوں سے یہ تو نہیں کہا تھا کہ تم ایسے عقیدے رکھو۔ ایسے ہی حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے لوگوں سے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ اس طرح کی عقیدت رکھو۔ اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قصور نہیں ہے۔ اگر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالے سے کسی نے کوئی جھوٹ مشہور کیا ہے یا کسی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام سے کوئی جھوٹ مشہور کیا ہے تو اس کا رد تو کرنا ہی پڑے گا۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی کام کیا ہے اور بڑے محتاط انداز میں ان عقائد کی حفاظت فرمائی ہے۔ اعمال، احوال اور ادب و آداب کے بارے میں مکتوبات لکھے ہیں۔ پوری عمر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا دفاع کیا ہے۔ لیکن اندازہ کیجئے کہ اپنی دعاؤں میں یہ کہا کرتے تھے کہ اے اللہ! اہل بیت کے طفیل میری دعاؤں کو قبول فرما۔ باقاعدہ صراحتاً فرمایا ہے کہ اہل بیت کے تمام ائمہ کرام حضرت امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ، امام کاظم رحمۃ اللہ علیہ اور بعد والے دوسرے حضرات، بارہ کے بارہ ائمہ کرام بڑے اولیاء اللہ تھے، ان کے ذریعہ سے باقی لوگوں کی روحانیت محفوظ ہے۔ یہ مکتوب شریف گزر چکا ہے، اُس میں صاف صاف یہ بات فرمائی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت نے انتہائی درجہ کا محتاط اور مضبوط رویہ رکھا ہے۔ کہتے ہیں جہاں تلوار پڑنی ہے وہیں پڑے۔ آگے پیچھے بالکل نہ کٹے۔ یہ کمال کی بات ہوتی ہے کہ جہاں پر وار کرنا ہے اسی جگہ ہی وار ہو۔ آگے پیچھے نہ جائے۔ حضرت نے اسی انداز میں کام کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

متن:

جو خطاب آپ نے ظاہر طور پر نفس کی طرف کئے ہیں واضح ہوئے ہاں نفس کی امارگی (سرکشی) کے زمانے میں اس پر اعتراض کریں وہ مسلم ہے لیکن (نفس کے) مطمئنہ ہو جانے کے بعد اُس پر اعتراض کرنے کی گنجائش نہیں ہے کیونکہ نفس اس مقام میں پہنچ کر حق سبحانہ وتعالیٰ سے راضی اور سبحانہ وتعالیٰ اس سے راضی ہو جاتا ہے پس جب وہ (حق تعالیٰ کا) پسندیدہ و مقبول (بندہ) ہو گیا تو اس پر اعتراض جائز نہیں، کیونکہ اس کی مراد حق سبحانہ و تعالیٰ کی مراد ہو جاتی ہے، لہذا اس دولت کا حاصل ہونا حق سبحانہ وتعالیٰ کے اخلاق کے ساتھ متخلّق (متصف) ہونے کے تحت ہے، اس کا مقدس میدان (صحن) ہم پست فطرت لوگوں کے اعتراض سے بہت بلند و بالا ہے، ہم جو کچھ کہتے ہیں وہ ہماری طرف لوٹ آتا ہے۔ **بیت**

آگہ از خویشتن چو نیست جنین

چہ خبردار داز چنان و چنین

(جو بچہ اپنی ماں کے پیٹ میں ہے اُسے اِس کی خبر ہے نہ اُس کی)

اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جاہل لوگ اپنی حد درجہ جہالت کی وجہ سے نفسِ مطمئنہ کو نفسِ امارہ خیال کر لیتے ہیں اور نفس کی امارگی کے احکام نفسِ مطمئنہ پر جاری کر دیتے ہیں جیسا کہ کفار نے انبیاء علیہم الصلواتُ والتسلیمات کو دوسرے انسانوں کی طرح خیال کر کے نبوت کے کمالات سے انکار کیا ہے۔ حق سبحانہ وتعالیٰ ان اکابر بزرگوں علیہم الصلوات والتحیات اور اُن کے تابعداروں کے انکار سے بچائے۔

تشریح:

اس میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بتادیا ہے کہ ہم لوگ شر کی مخالفت کریں گے، خیر کی مخالفت نہیں کریں گے۔ نفسِ امارہ شر ہے اور نفسِ مطمئنہ خیر ہے۔ ایک پکی بات یہ بھی ہے جس پر حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بڑا زور دیا اور حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی بڑا زور دیا ہے کہ مبتدی اور منتہی ایک جیسے نظر آتے ہیں جبکہ متوسط مختلف نظر آتا ہے۔ مثلاً مبتدی تکلیف کے موقع پر روتا ہے۔ منتہی بھی روتا ہے لیکن منتہی تکلیف سے نہیں روتا بلکہ اللہ کے سامنے عاجزی ظاہر کرنے کے لئے روتا ہے۔ عام لوگوں کو دونوں کا رونا نظر آرہا ہے کہ دونوں رو رہے ہیں۔ لیکن متوسط کا معاملہ الگ ہے۔ جب مصیبت آئے گی تو متوسط قہقہے لگا رہا ہوگا۔ مثال کے طور پر اس کو کسی نے اطلاع کر دی کہ آپ کا بیٹا فوت ہو گیا ہے، تو وہ ہنس پڑے گا کہ اللہ پاک نے قبول فرمالیا۔ اب یہ متوسط آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا تو نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے بھی حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات پر آنسو جاری ہو گئے تھے۔ کسی نے پوچھا کہ حضرت آپ بھی؟ فرمایا: یہ تو رحمت ہے۔ ہاں زبان سے ہم ایسی بات نہیں کریں گے جس سے نقصان ہو۔

الغرض متوسط مختلف نظر آتا ہے جبکہ مبتدی اور منتہی ایک جیسے نظر آتے ہیں۔ عام لوگ سب کو اکٹھا سمجھ لیتے ہیں، ایک ہی بات سمجھ کر ان کے ساتھ ایک جیسا ہی معاملہ کرتے ہیں۔

ایک بات تو یہ ہوئی اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ لوگ چونکہ خود نفسِ امارہ کے مارے ہوئے ہوتے ہیں، اس لئے دوسروں کو بھی اپنے جیسا سمجھ لیتے ہیں اور دوسروں کے بارے میں یہ سوچ ہی

نہیں سکتے کہ وہ ان سے مختلف ہیں۔ یہ گمان کرتے ہیں کہ میرے ساتھ ایسا ہے تو ان کے ساتھ بھی ایسا ہو گا۔ حقیقت میں ان کا اپنا نفس نفسِ امّارہ ہوتا ہے اور اپنے آپ کو حق پر سمجھ رہا ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ باقی لوگوں کو بھی اس قسم کا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایسی باتیں صحیح نہیں ہیں۔ اللہ والے ان چیزوں سے پاک ہوتے ہیں۔ اللہ پاک ہمیں معاف فرمائے۔ آگے ایسے لوگوں سے بچنے کا ذکر آرہا ہے۔

پیر ناقص سے طریقہ اخذ کرنے کے نقصانات:

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ دفتر اول کے مکتوب نمبر 23 میں ارشاد فرماتے ہیں:

متن:

کمالات کے ظہور کی استعداد رکھنے والے بھائی! حق سبحانہ و تعالیٰ آپ کے فعل کی استعداد کو عملی جامہ پہنانے کی توفیق بخشے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ بے شک دنیا آخرت کی کھیتی ہے پس اس شخص کے لئے افسوس کا مقام ہے جس نے اس میں کچھ نہیں بویا اور اپنی استعداد کی زمین کو بیکار رہنے دیا اور اعمال کے بیج کو ضائع کر دیا اور یہ بھی جاننا چاہئے کہ زمین کا ضائع و بیکار کرنا دو طرح پر ہے ایک یہ کہ اس میں کوئی چیز کاشت ہی نہ کی جائے اور دوسرے یہ کہ اس میں گھٹیا (نکمّا) اور خراب بیج ڈالا جائے، اور یہ دوسری قسم ضائع کرنے میں پہلی قسم سے زیادہ شدید نقصان دہ اور بہت زیادہ خرابی والی ہے جیسا کہ یہ بات پوشیدہ نہیں ہے اور بیج کا نکمّا اور خراب ہونا اس طرح پر ہے کہ کسی ناقص سالک سے طریقہ اخذ کرے اور اس کے مسلک (راستے) پر چلے اس لئے کہ ناقص سالک اپنی خواہشاتِ نفسانی کی پیروی کرتا ہے اور جو شخص خواہشاتِ نفسانی کے تابع ہوتا ہے اس کا اپنا کچھ نہیں ہوتا، اور اگر (بالفرض) کوئی اثر ہوتا بھی ہو تو وہ خواہشاتِ نفسانی ہی کی مدد کرے گا پس اس

سے سیاہی پر مزید سیاہی حاصل ہو گی، اور اس لئے بھی کہ ناقص (پیر) ان طریقوں میں جو حق سبحانہ وتعالیٰ تک پہنچانے والے ہیں اور ان طریقوں میں جو حق سبحانہ وتعالیٰ تک نہیں پہنچاتے تمیز نہیں کر سکتا کیونکہ وہ خود واصل نہیں ہے اور اسی طرح وہ طالبانِ طریقت کی مختلف استعدادوں کے درمیان تمیز نہیں کر سکتا، اور جب وہ جذبہ (سیر انفسی) اور سلوک (سیر آفاقی) کے طریقوں میں تمیز نہیں کر سکتا تو بسا اوقات طالب کی استعداد ابتدا میں طریقۂ جذبہ کے مناسب ہو گی اور طریقۂ سلوک کے مناسب نہیں ہو گی اور ناقص پیر ان دونوں طریقوں اور طالبین کی مختلف استعدادوں میں تمیز نہ کر سکنے کی وجہ سے ابتدا میں سلوک کے طریقہ پر چلائے گا۔ پس جس طرح وہ خود طریقہ سے بھٹکا ہوا (گمراہ) ہے اسی طرح اس طالب کو بھی راہِ حق سے بھٹکا دے گا پس شیخِ کامل مکمل (یعنی جو خود کامل ہو اور دوسروں کو کامل کرنے والا ہو) جب اس طالب کی تربیت کرنا اور اس کو اس راستہ پر چلانا چاہے تو سب سے پہلے اس کو اس خرابی کے دُور کرنے کی ضرورت پیش آئے گی جو اس طالب کو ناقص پیر سے پہنچی ہے اور اس فساد (بگاڑ) کی اصلاح کرنی ہو گی جو اس میں اس ناقص پیر کے سبب سے پیدا ہوا ہے۔ پھر اس کی زمین میں اس کی استعداد کے مناسب صالح (عمدہ) بیج ڈالے گا تب اس سے اچھی کھیتی اُگے گی۔

تشریح:

اگر میں اس مضمون کو مکتوب نمبر 287 کے ساتھ ملادوں تو مضمون مکمل واضح ہو جائے گا۔ مکتوب 287 بہت معرکۃ الآراء مکتوب ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ ایک انقلابی مکتوب ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو جس کیفیت میں لکھا ہے وہ کیفیت مکتوب شریف میں

حضرت نے خود ہی ظاہر فرمائی ہے۔ اپنے بھائی کو لکھتے ہیں کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ لوگ جذب اور سلوک کے سمجھنے میں گڑبڑ کر رہے ہیں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ جذب کیا ہوتا ہے اور سلوک کیا ہوتا ہے۔ (اس مکتوب میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے لئے کچھ کسرِ نفسی کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اور فرمایا ہے کہ) میرے خاطر فاتر میں یہ آتا ہے کہ میں اس پر کچھ کلام کروں۔ پھر جذب کو واضح کیا ہے کہ جذب کیا ہوتا ہے۔ پھر سلوک کو واضح کیا ہے کہ سلوک کیا ہوتا ہے۔ اس کے بعد فرمایا ہے کہ لوگ جذب ہی کو کمال سمجھ لیتے ہیں، کہ ہم کامل ہو گئے ہیں اور اس کے ذریعہ سے سلوک بھی طے ہو گیا ہے۔ حالانکہ ابھی سلوک طے نہیں ہوا ہوتا۔

حضرت نے تو بڑی تفصیل سے یہ بات ذکر کی ہے۔ میں ذرا مختصر طور پہ عرض کرنا چاہوں گا، کیونکہ اپنے موقع پہ تفصیلاً بیان ہو چکا ہے۔

مثلاً میں کسی لوہے، سٹیل، ایلومینیم یا کسی اور دھات تانبے وغیرہ سے کوئی چیز بنانا چاہتا ہوں۔ اسے کوئی خاص صورت دینا چاہتا ہوں مثلاً اس سے کوئی گھڑا بنانا چاہتا ہوں، کوئی پائپ بنانا چاہتا ہوں یا کوئی اور چیز بنانا چاہتا ہوں تو مجھے اس کے لئے کیا کرنا ہو گا؟ پہلے میں اس دھات کو گرم کروں گا، جب گرم کرنے سے نرم ہو جائے گی تو پھر میں اس کو shape (مخصوص صورت) دوں گا۔ اس کے لئے فیکٹریوں میں باقاعدہ طریقۂ کار ہوتے ہیں۔ اگر میں گرم اور نرم کئے بغیر اس کو موڑنا چاہوں تو وہ دھات نہیں مڑے گی بلکہ درمیان سے ٹوٹ جائے گی اور ضائع ہو جائے گی۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں یہ بات ذکر کی ہے۔ اگر میں سالک کو جذب سے نہ گزاروں اور ابتداء ہی سے اس کا سلوک طے کرانا شروع کر دوں تو یہ پھٹ جائے گا۔ اس کی اصلاح نہیں ہو گی

بلکہ یہ کٹ جائے گا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی یہ اس کی برداشت سے باہر ہے۔وہ ٹوٹ جائے گا۔ پہلے اس کو جذب کی بھٹی میں گرم کرو۔اللہ تعالی کے ساتھ اس کو گرما گرمی کا ایسا تعلق اور ایسی محبت حاصل ہو جائے کہ اس کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جائے۔تب اسے آپ جس بات کے بارے میں کہیں گے کہ یہ اللہ کے لئے ہے۔وہ کہے گا کہ ٹھیک ہے بالکل صحیح ہے۔اب یہ نرم ہو چکا ہے۔ اب اسے اس مخصوص صورت میں ڈھالنے کا وقت ہے۔اب اگر آپ نے اس کو ویسے ہی رہنے دیا تو آپ نے اس کو ضائع کر دیا۔کیونکہ جذب ہمیشہ کے لئے نہیں ہوتا بلکہ عارضی طور پر ہوتا ہے۔کچھ عرصہ کے بعد چلا جاتا ہے۔اگر یہ ویسے ہی ٹھنڈا ہو گیا تو آپ نے وہ ساری محنت ضائع کر دی۔بلکہ پھر ایک اور خطرناک صورت بھی بن جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسا شخص ''مٹہ کور'' ہو جائے گا۔پشتو میں ''مٹہ کور'' چکنے گھڑے کو کہتے ہیں۔جب یہ چکنا گھڑا بن گیا تو پھر اس کی اصلاح ہی نہیں ہو سکے گی اور یہ بالکل منکر بن جائے گا۔لہٰذا یہ کام ترتیب کے ساتھ کرنا ہوتا ہے۔

اگر انسان جذب حاصل کرتا ہے تو اس کے لئے بھی کامل شیخ کی ضرورت ہے۔اگر کامل شیخ کی رہنمائی حاصل نہ ہو تو انسان اس منزل پر نقصان بھی اٹھا سکتا ہے۔جیسا کہ حضرت نے تفصیل کے ساتھ مکتوب نمبر 287 میں بیان فرمایا ہے کہ ایسے وقت میں احوال تبدیل ہو رہے ہوتے ہیں کیونکہ جذب تلوین کی حالت ہوتی ہے۔سلوک سے حالتِ تمکین آتی ہے۔تلوین تبدیلی کو کہتے ہیں۔جب انسان جذب میں ہوتا ہے تو اس وقت احوال میں مسلسل تبدیلی ہو رہی ہوتی ہے۔وہ سمجھتا ہے کہ شاید ان تبدیلیوں کی وجہ سے میرا سلوک طے ہو رہا ہے۔حالانکہ وہ سلوک نہیں ہوتا بلکہ جذب کے احوال تبدیل ہو رہے ہوتے ہیں۔جس وقت کوئی لوہا گرم کیا جاتا ہے تو اس کے

رنگ بدلتے ہیں اسی طرح حالت جذب میں احوال تبدیل ہو رہے ہوتے ہیں جس سے یہ سمجھتا ہے کہ میرا سلوک طے ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان مسائل سے بچائے۔

آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ نقشبندی سلسلے کے بعض حضرات سے میری بات چیت ہوئی۔ جب میں نے ان سے کہا کہ یہ جذب کسبی ہے تو وہ میرے سخت مخالف ہو گئے اور پتا نہیں مجھے کیا کیا سمجھنے لگے۔ کہنے لگے کہ آپ کو مکتوبات کی سمجھ نہیں آ رہی۔ آپ ویسے ہی اپنی طرف سے باتیں کر رہے ہیں۔ پھر میں نے حضرت کے مکتوبات سے وہ تمام چیزیں نکال نکال کر انہیں بتائیں۔ انہوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ سلوک جذب کے ساتھ ہی طے ہوتا ہے۔ میں نے کہا کہ حضرت مجدد الف ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہی رونا روتے ہیں کہ سلوک جذب کے ساتھ نہیں ہوتا بلکہ سلوک ایک علیحدہ چیز ہے۔ اس کے لئے حضرت نے ایک زبردست مثال دی ہے جس کو اگر کوئی نہ سمجھے تو اس کے لئے دعا ہی کی جا سکتی ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ مثال دیتے ہیں کہ جیسے کوئی شخص خانہ کعبہ کی زیارت کے لئے، طواف کے لئے، عمرہ کے لئے یا حج کے لئے جا رہا ہے۔ اسے خانہ کعبہ کا پتا نہیں ہے کہ خانہ کعبہ کیسا ہے۔ اس نے ذہن میں ایک خاکہ بنا لیا کہ خانہ کعبہ ایسا ہو گا۔ راستے میں اسے کوئی عمارت ایسی معلوم ہوتی ہے کہ شاید خانہ کعبہ ہے۔ وہ وہاں ٹھہر جاتا ہے اور طواف و اعتکاف کرنے لگتا ہے۔ حضرت فرماتے ہیں: یہ شخص علماً بھی محروم ہے، عملاً بھی محروم ہے۔ دوسرا شخص ہے جس کو خانہ کعبہ کا پتا ہے کہ کیسا ہے۔ اسے اچھی طرح علم ہے لیکن وہ ایک قدم بھی باہر نہیں نکالتا، اپنی جگہ پہ رہتا ہے۔ یہ شخص علماً محروم نہیں ہے لیکن عملاً محروم ہے۔ تیسرا آدمی جو چل پڑا ہے لیکن ابھی پہنچا نہیں ہے۔ یہ نہ علماً محروم ہے نہ ہی عملاً محروم ہے۔

لیکن ابھی راستہ میں ہے۔ پہنچا یہ بھی نہیں ہے۔ چوتھا وہ شخص ہے جو باقاعدہ پہنچ چکا ہے۔ یہ وہ شخص ہے جو خود بھی پہنچا ہے اور دوسروں کو بھی پہنچا سکتا ہے۔ پہلی مثال مجذوب متمکن کی ہے۔ یہ مجذوب متمکن ہے، جس نے اپنے جذب کو قابو کر لیا اور سمجھا کہ میرا سلوک مکمل ہو گیا۔ یہ شخص ایسا ہوتا ہے کہ اس کے اندر جذب کی وجہ سے کچھ صفات پیدا ہو جاتی ہیں اور اس کی توجہ کی قوت بہت تیز ہو جاتی ہے۔

آج کل یہ مسئلہ عام ہے کہ لوگ توجہ سے دوسرے لوگوں کو کھینچتے ہیں۔ ان کی توجہ کی قوت بہت زبردست ہوتی ہے۔ ان کے احوال بڑے عالی شان ہوتے ہیں۔ لوگ ان سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔ عموماً عوام کی توجہ ان کی طرف ہوتی ہے، کاملین کی طرف نہیں ہوتی۔ کیونکہ کاملین سادہ لوگ ہوتے ہیں۔ سادگی کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کے ہاں کوئی ظاہری نمود و نمائش اور شور شرابا نہیں ہوتا۔ جبکہ متوسطین کے ساتھ کچھ مسائل ہوتے ہیں۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے متوسطین کی مثال دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ متوسط کی مثال ہری بھری فصل کی سی ہے۔ اگر اسی وقت اسے کاٹ دیا جائے تو سوائے چارہ کے کسی کام نہ آئے۔ جب کہ منتہی کی مثال پکی ہوئی فصل کی سی ہوتی ہے جو آنکھوں کو اتنی بھلی نہیں لگتی لیکن کام کی چیز وہی ہوتی ہے۔ اسی کے لئے فصل کو بویا گیا ہوتا ہے۔ اصل مقصود وہی ہوتا ہے۔ ہری بھری چیز کی طرف سب لوگ آجاتے ہیں کیونکہ وہ دیکھنے میں بڑی خوشنما ہوتی ہے لیکن پکی ہوئی فصل کی طرف کم لوگ آتے ہیں۔

مجذوب متمکن قسم کے لوگوں کی ایک خرابی یہ بھی ہے کہ یہ لوگ جب شیخ بن جاتے ہیں تو خود بھی خراب ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی خراب کرتے ہیں۔ یہ ابھی منتہی مرجوع نہیں ہوتے۔

شیخ منتہی مرجوع ہونا چاہئے۔ منتہی مرجوع وہ ہوتا ہے جس نے اپنے نفس کو فنا کیا ہوتا ہے۔ وہ اپنے نفس کے اثر سے نکل چکا ہوتا ہے۔ اپنے نفس پہ قابو پا چکا ہوتا ہے۔ اس کو نفسِ مطمئنہ کہتے ہیں۔ اس کے لئے اللہ پاک نے فرمایا ہے:

﴿یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ O ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً O فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ O وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ﴾ (الفجر:26-29)

ترجمہ: ''(البتہ نیک لوگوں سے کہا جائے گا کہ) اے وہ جان جو (اللہ کی اطاعت میں) چین پا چکی ہے۔ اپنے پروردگار کی طرف اس طرح لوٹ کر آ جا کہ تو اس سے راضی ہو، اور وہ تجھ سے راضی۔ اور شامل ہو جا میرے (نیک) بندوں میں۔ اور داخل ہو جا میری جنت میں''۔

یہ خود اللہ تعالیٰ سے راضی ہے اور اللہ بھی اس سے راضی ہے۔ پس اس کو بندگی حاصل ہو جاتی ہے اور آخر جنت اس کو ایسے مل جاتی ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: نفسِ اَمّارہ اور نفسِ مطمئنہ کو اکٹھا نہ سمجھو۔ جو نفس امارہ کے حال میں ہیں ان کی بات اور ہے۔ جو نفس مطمئنہ پہ پہنچ گئے ان کی بات اور ہے۔ لیکن اگر کوئی مجذوب متمکن ہو گیا تو پھر اس کا نفس والا مسئلہ حل نہیں ہوا۔ اس کا نفس اب بھی فعال ہے۔ اس وجہ سے اس کے تمام اچھے کام بھی نفس کے لئے استعمال ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ اس کے ہاتھ چوم رہے ہیں وہ نفس کے لئے استعمال ہو گا۔ آپ اس کو نذرانے دے رہے ہیں وہ بھی نفس کے لئے استعمال ہو رہا ہے۔ وہ کہیں کسی کے ساتھ دین کی بات کر رہا ہے تو نفس کے لئے

استعمال ہو رہا ہے۔ کسی کو اچھی بات بتا رہا ہے تو نفس کے لئے استعمال ہو رہا ہے۔ اس کی باتیں بالکل صحیح ہیں لیکن وہ سب نفس کے لئے استعمال ہو رہی ہیں۔ جبکہ منتہی جس کو اللہ تعالی نے بنایا ہو گا، جس کا نفس مطمئنہ ہو گا، وہ اگر دھتکارے گا بھی تو اللہ کے لئے دھتکارے گا۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کتنے لوگوں کو دھتکارتے تھے۔ کہتے تھے: ''نکل جاؤ خانقاہ سے''۔ لیکن دل سے کھینچتے تھے کیونکہ وہ یہ سب اللہ کے لئے کرتے تھے۔ بظاہر حکم دیتے کہ باہر نکل جاؤ اور دل میں کہتے کہ اندر آ جاؤ۔

حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے بہت زیادہ مزاج شناس تھے۔ ایک دفعہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کسی کے اوپر سخت غصہ ہوئے۔ انہیں کہا کہ نکل جاؤ۔ نماز کا وقت تھا۔ نماز کے لئے مسجد میں تو آنا تھا۔ وہ صاحب حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بالکل پاس بیٹھے وضو کر رہے ہیں۔ حضرت مجذوب صاحب بھی وضو کر رہے ہیں۔ حضرت مجذوب صاحب انہیں کہتے ہیں: خبر بھی ہے کہ اس وقت تُو پوری محفل کا دولہا ہے۔ اس وقت حضرت کی جو توجہ آپ کی طرف ہے تمام لوگوں میں کسی اور کی طرف نہیں ہے۔ یہ ڈانٹ ویسے ہی نہیں پڑ رہی۔ اس وقت حضرت دل سے آپ کو کھینچ رہے ہیں۔ اصلاح کے لئے آپ کو ڈانٹ ضرور رہے ہیں لیکن دل سے کھینچ رہے ہیں۔ خبر دار! کوئی بُری بات دل میں نہ لانا۔

خود خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ دوات صحیح جگہ پہ نہیں رکھی۔ مصروف ہوں گے یا کسی کام کے لئے اٹھ گئے ہوں گے۔ دوات وہیں پڑی رہی۔ کوئی آیا، اس کے پیر

کے ساتھ ٹھوکر لگ گئی اور ساری سیاہی فرش پہ گر گئی۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو پتا چلا تو حضرت نے سخت سرزنش فرمائی۔ فرمایا کہ نکل جاؤ خانقاہ سے۔ تمہیں یہ بھی تمیز نہیں ہے کہ دوات کہاں رکھی جاتی ہے۔ یہ کوئی طریقہ ہے؟ مجذوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ حکم پر عمل کرتے ہوئے خانقاہ سے نکل گئے سیڑھیوں کے پاس بیٹھ گئے۔ صاحبِ ذوق شاعر تھے اور حضرت نے بھی دلی طور پر نہیں نکالا تھا۔ تھوڑی دیر بعد پوچھا وہ باؤلا کدھر گیا؟ لوگوں نے کہا حضرت وہ تو سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا ہے اور مزے سے یہ شعر کہہ رہا ہے۔

اُدھر وہ در نہ کھولیں گے اِدھر میں در نہ چھوڑوں گا
حکومت اپنی اپنی ہے کہیں ان کی کہیں میری

فرمایا: ان کو بلاؤ۔ بلایا گیا۔ کہا: آئندہ اس قسم کی حرکتیں نہ کرنا۔ انہوں نے کہا: ٹھیک ہے حضرت۔ فرمایا: بیٹھ جاؤ۔

یہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا اپنا ایک جلالی انداز تھا اور اس سے بہت سارے لوگوں کی اصلاح ہو جاتی تھی۔ یہ بگڑا ہوا نفس آسانی سے ٹھیک نہیں ہوتا۔ بہر حال! ایسے لوگوں کا دھتکارنا بھی اللہ کے لئے ہوتا ہے۔ اس سے لوگ بن رہے ہوتے ہیں۔ نفس والوں کا بلانا بھی نفس کے لئے ہوتا ہے اس سے لوگ بگڑ رہے ہوتے ہیں۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پہ فرمایا کہ ان کو ایک جیسا نہ سمجھو۔ ناقص پیر کے پاس کوئی جائے گا تو اپنی صلاحیتوں کو ضائع کر دے گا۔ کیونکہ صلاحیتیں غلط چیز کے لئے استعمال ہو جائیں گی۔ نفس کے لئے استعمال ہو جائیں گی۔ صلاحیتیں اس لئے تو نہیں دی گئی

تھیں۔اس وجہ سے فرمایا کہ ایسے لوگوں سے اپنی استعداد کو ضائع نہ کرواؤ۔

پھر یہ بھی بہت عجیب بات فرمائی کہ اگر کوئی غلط پیر کے پاس گیا اور اس کے بعد صحیح پیر کے پاس جائے گا۔ تو اسے دگنا کام کرنا پڑے گا۔ پہلے اس کی ناقص تعمیر کو گرائے گا پھر اس پہ صحیح تعمیر کرے گا۔ غلط پیر کی وجہ اس کی جو چیزیں خراب ہو گئی ہیں پہلے ان کو ٹھیک کرے گا۔ اس کے بعد اصلاح کرے گا۔ اس طرح کام مشکل ہو جائے گا۔ لہٰذا ابتدا ہی سے جو شخص صحیح پیر کی طرف چلا جائے، اسے بہت فائدہ ہوتا ہے۔

یہ بات صحیح ہے کہ اگر کوئی آدمی خدانخواستہ غلط پیر کے پاس چلا جائے تو اس کی اصلاح میں بڑے مسئلے ہوتے ہیں۔ میرے ہاں یہ مسائل اتنے زیادہ پیش آتے ہیں کہ کبھی کبھی تو میں حیران و پریشان ہو جاتا ہوں۔ مثلاً مجھے اچھی طرح علم ہے کہ فلاں آدمی صحیح پیر نہیں ہے (جیسے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے وقت کے لوگوں کے بارے میں پتا تھا۔ اسی طرح ہمیں اپنے وقت کے لوگوں کے بارے میں پتا ہوتا ہے) لیکن اس کا مرید ہماری مجلس میں بیٹھا ہوا ہے اور میں یہ بات کرتا ہوں کہ اپنے شیخ کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ بزرگوں نے لکھا ہے کہ آپ اپنے شیخ کے مقام کو جتنا بڑا سمجھیں گے اتنا ہی آپ کو زیادہ فائدہ ہو گا۔ اب یہ بات کر کے میں اس کو نقصان پہنچا رہا ہوں گا۔ جو صحیح لوگوں کے ساتھ وابستہ ہیں انہیں تو فائدہ ہو گا لیکن اس مجلس میں ہی اگر کوئی ایسا شخص بیٹھا ہو گا جو غلط پیر سے بیعت ہے تو اسے نقصان ہو رہا ہو گا کیونکہ وہ جتنا اپنے اس شیخ کی طرف متوجہ ہو گا اسے اتنا زیادہ نقصان ہو گا۔ کبھی کبھی میرے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ تین چار آدمی اس قسم کے بیٹھے ہوتے ہیں اور میرے لئے بات کرنا اتنا مشکل ہو جاتا ہے کہ میں پریشانی میں پڑ

جاتا ہوں کہ کیسے بات کروں کہ اسے نقصان کی بجائے فائدہ ہو۔

ایک مرتبہ ایک صاحب میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ شاہ صاحب میرا اپنے پیر صاحب کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں ہے۔ اگر میں آپ کے ساتھ تعلق جوڑ لوں تو کیسا رہے گا؟ مجھے اس کے پیر صاحب کے بارے میں علم تھا کہ ان میں کچھ مسائل ہیں۔ لیکن میں اسے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ آپ کا پیر ٹھیک نہیں ہے۔ اگر میں ایسا کہتا تو اسی وقت سارا کچھ خراب ہو جاتا۔ میں نے اسے کہا: اچھا ٹھیک ہے، دیکھیں گے۔ اس نے پھر اپنی بات دہرائی۔ میں نے کہا بھئی بیعت کی ضرورت نہیں ہے لیکن آپ اصلاح کے لئے رابطہ کر سکتے ہیں۔ کیونکہ نقشبندیت میں شیخِ تعلیم کا طریقہ موجود ہے۔ یعنی ایسا ہو سکتا ہے کہ بیعت کئے بغیر صرف اصلاح کی جائے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں آپ کا شیخِ تعلیم بن جاتا ہوں۔ ہمارے ہاں طریقہ یہ ہے کہ معمولات کا چارٹ بھرنا ہوتا ہے۔ آپ اپنے معمولات کا چارٹ بھرنا شروع کریں۔ ایک ماہ بعد جب اس نے معمولات کا چارٹ مجھے دیا تو میں نے دیکھا کہ اس میں فجر کی نماز بالکل نہیں ہے اور مراقبات کی بڑی تفصیل موجود ہے۔ میں نے کہا خدا کے بندے! آپ کے ان مراقبات کا آپ کو کیا فائدہ ہو رہا ہے؟ ایک فرض آپ سے مسلسل چھوٹ رہا ہے۔ ایک دو دن کی بات نہیں بلکہ مسلسل چھوٹ رہا ہے اور آپ کو اس کی فکر ہی نہیں ہے۔ آپ کے مراقبوں کا آپ کو کوئی فائدہ نہیں ہو رہا۔ کہنے لگے کہ میرے ساتھ یہ مسئلہ ہے کہ میں فجر کی نماز نہیں پڑھ سکتا۔ میں نے کہا: آپ کے لئے سب سے پہلا کام فجر کی نماز پڑھنا ہے۔ باقی سب وظیفے بعد میں ہیں۔ آپ سب سے پہلے فرض نماز شروع کریں۔ اسے ٹھیک کریں۔ اس کے لئے آپ کو جو بھی طریقہ اختیار کرنا ہو اختیار کریں۔ آپ کی ابتدا اسی سے ہو گی۔ خیر! اللہ پاک

نے توفیق دی اور اس کی فجر کی نماز شروع ہو گئی۔ پھر اللہ پاک نے اس پہ یہ بات کھول دی۔ ایک دن مجھے کہنے لگے کہ اب مجھے سمجھ آ گیا ہے کہ تصوف کیا چیز ہے۔ میں نے کہا کہ تصوف یہی چیز ہے۔ تصوف اعمال پہ آنے کا نام ہے۔ یہ کوئی علیحدہ چیز نہیں ہے شریعت ہی کے اعمال ہیں۔ کوئی مختلف چیز نہیں ہے۔ تصوف کے دو ہی مقاصد ہیں۔ شریعت کے اعمال پر پختگی اور صحیح عقائد۔ اگر یہ نہ ہوں پھر تو تصوف کا بنیادی مقصد ہی حل نہیں ہوتا۔

دفتر اول مکتوب نمبر 61 میں ارشاد فرماتے ہیں:

متن:

کیونکہ فائدہ پہنچانا اور فائدہ حاصل کرنا دونوں طرف کی مناسبت پر موقوف ہے اور ابتدا میں طالبِ طریقت کو اپنی نہایت پستی و کمینگی کے باعث حق تعالیٰ عزَّ سلطانُہٗ کی پاک بارگاہ کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں ہوتی اس لئے دونوں طرف (یعنی خالق و مخلوق کے درمیان) تعلق والا ایک واسطہ (برزخ) ہونا ضروری ہے، اور وہ شیخِ کامل و مکمل ہے، اور طلب میں فتور و سستی واقع ہونے کا سب سے بڑا قوی سبب شیخِ ناقص کی طرف رجوع کرنا ہے، جس نے ابھی اپنا جذبہ و سلوک کا کام پورا نہیں کیا۔

تشریح:

اس سے مراد وہی مجذوب متمکن ہے جس نے ابھی اپنا جذب و سلوک کا کام پورا نہیں کیا۔

متن:

اور شیخی و پیری کی مسند پر بیٹھ گیا اس کی صحبت طالب کے لئے زہر قاتل ہے اور اس کی طرف

رجوع کرنا مہلک مرض ہے، اس قسم کے شیخ کی صحبت طالب کی بلند استعداد کی پستی میں لے آتی ہے اور بلندی سے پستی کے غار میں گرا دیتی ہے مثلاً جو مریض ناقص طبیب سے علاج کرائے وہ اپنی بیماری کے زیادہ کرنے میں کوشش کرتا ہے اور اپنے مرض کے زائل کرنے کی قابلیت کو ضائع کر دیتا ہے، اگرچہ ابتدا میں وہ دوائی مرض میں کچھ تخفیف کر دے لیکن حقیقت میں وہ عین مضر ہے۔ یہ مریض اگر بالفرض کسی حاذق (تجربہ کار) طبیب کے پاس جائے تو وہ طبیب پہلے تو اس دوا کی تاثیر کو زائل کرنے کی فکر کرے گا اور مسہلات کے ساتھ اس کا علاج کرے گا۔ اس تاثیر کے زائل ہو جانے کے بعد (اصلی) مرض کے دور کرنے کی طرف توجہ کرے گا۔

ان بزرگواروں قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم کے طریق کا دارومدار (پیر کی) صحبت پر ہے اور (صرف) کہنے سننے سے کوئی کام نہیں بنتا بلکہ طلب میں سُستی پیدا ہو جاتی ہے۔

تشریح:

ساری بات وقت اور زمانے کی ہے۔ ایک وقت میں ایک طریقے سے کام ہوتے ہیں۔ دوسرے وقت میں وہ طریقے کام نہیں آتے بلکہ کوئی اور طریقے موثر ہوتے ہیں۔ اللہ جل شانہٗ نے پورا ایک نظام بنایا ہے۔ جو اس نظام کے تحت چلتا ہے وہی منزل تک پہنچتا ہے۔ میں صاف بات عرض کرتا ہوں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کسی شخص کا رشتہ دار نہیں ہے اسی طرح کسی سلسلے کا بھی رشتے دار نہیں ہے۔ لہٰذا اللہ جل شانہٗ اگر کسی خاص سلسلے سے کام لینا چاہتا ہے تو اس کے لئے وہ احوال پیدا ہو جاتے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں نقشبندی سلسلہ میں فائدہ کے حصول کے لئے صحبتِ شیخ لازمی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جو مسائل پیدا ہو گئے تھے ان کا علاج

اسی میں تھا۔ لہٰذا انہوں نے دوری کو کم کرنے کی کوشش کی اور صحبت کو ضروری قرار دیا۔ صحبت ہو تو مرید کی اصلاح زیادہ بہتر طریقہ سے ہو سکتی ہے۔ لہٰذا انہوں نے صحبت کو لازم پکڑا ہوا تھا۔ اس لئے نقشبندی سلسلہ میں انعکاسی نسبت سے بات شروع ہوتی ہے۔ یہ انعکاسی نسبت صحبت کے ذریعہ ہوتی ہے۔ جس سے ابتداءً مرید کو فائدہ ہونا شروع ہوتا ہے۔ ابتدا میں شیخ کی صحبت کی وجہ سے کام ہوتا رہتا ہے۔ بعد میں آہستہ آہستہ مرید خود بھی کام شروع کر لیتا ہے۔

ہمارے زمانے میں گاڑیوں کا ایک ہینڈل ہوتا تھا۔ پہلے اس ہینڈل کو چلاتے تھے۔ جب وہ چل پڑتا تو پھر اس میں ڈرائیور بیٹھ کے گاڑی چلاتا تھا۔ جیسے موٹر سائیکل کو kick (کِک) لگاتے ہیں، اسی قسم کی چیز تھی۔ جب تک وہ نہیں چلتا تھا گاڑی بھی نہیں چلتی تھی۔ اس کا کوئی سیلف سٹارٹ والا طریقہ نہیں ہوتا تھا۔ یہی معاملہ پرانے زمانے کے تصوف میں بھی ہوتا تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ سالک کو بھی سٹارٹ کروانا ہوتا تھا۔ پہلے صحبت کے ذریعہ سٹارٹ کرواتے تھے۔ اس کے بعد وہ خود چلنا شروع کر لیتا تھا۔

میں نے ایک مرتبہ ایک خواب دیکھا کہ حضرت مولانا اشرف صاحب رحمۃ اللہ علیہ تشریف فرما ہیں۔ ان کے ہاتھ میں آئینہ ہے۔ خواب میں مجھے اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ میری طرف دیکھو۔ میں نے دیکھا تو آئینے میں مدینہ منورہ کا راستہ نظر آیا۔ ایسے محسوس ہوا کہ گویا وہ راستہ چل رہا تھا۔ جیسے کوئی آگے جا رہا ہو تو راستہ پیچھے کی طرف دوڑتا اپنی طرف آتا محسوس ہوتا ہے۔ اگرچہ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ آئینہ ہے لیکن بہر حال اس میں راستہ قریب آ رہا تھا۔ پھر وہ راستہ گاڑی بن گیا اور یہ آئینہ Wind screen بن گیا۔ جیسے Wind screen میں انسان کو فاصلہ طے ہوتا محسوس

ہوتا ہے۔ ایسے ہی اس میں فاصلہ طے ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ بہت تیزی کے ساتھ جا رہا تھا۔ اچانک میں دیکھتا ہوں کہ مدینہ منورہ پہنچ گیا ہوں اور سامنے روضۂ اقدس نظر آ گیا ہے۔ وہاں ایک بہت بڑا گرین بورڈ لگا ہوا ہے۔ پھر گاڑی غائب ہو گئی اور میں پیدل چلنے لگتا ہوں۔ پھر میں راستہ میں کسی کو کہتا ہوں کہ کمال ہے لوگ یہاں سے خانہ کعبہ دور سمجھتے ہیں، حالانکہ خانہ کعبہ بھی ادھر ہی ہے۔ لوگ ویسے ہی اس کو دور سمجھ رہے ہیں۔

میں نے یہ خواب اپنے شیخ مولانا اشرف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو سنایا۔ حضرت نے فرمایا: آئینہ تو میں ہوں۔ خواب میں شیخ آئینہ ہوتا ہے۔ اور جو مدینہ منورہ کا راستہ نظر آیا ہے اس سے مراد ہمارا سلسلہ ہے۔ ہمارا طریقۂ کار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہی جاتا ہے۔ سارے کاموں کا نتیجہ وہی ہوتا ہے۔ پھر فرمایا کہ پہلے آپ چلائے جا رہے ہیں۔ پھر بعد میں جب آپ خود چلنا شروع کر لیں گے تو میں درمیان سے نکل جاؤں گا۔

خواب کے دوسرے حصہ کے بارے میں فرمایا کہ دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کو اللہ کے ساتھ محبت کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق ہوتا ہے۔ اور کچھ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کی وجہ سے اللہ پاک کے ساتھ تعلق ہوتا ہے۔ آپ کا راستہ دوسرا ہے۔ ویسے دونوں راستے ہی ٹھیک ہیں۔ نتیجہ ایک ہی ہے۔ اس تعبیر سے میں سمجھ گیا۔

ابتدا میں مرید کو صحبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعد میں وہ خود چلنا شروع کر لیتا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی بات فرمائی کہ ہمارا طریقہ تو یہی ہے کہ ابتدا میں صحبت ہوتی ہے۔ لیکن اب دوسرا دور آ گیا ہے۔ اس وقت صورت حال پہلے جیسی نہیں رہی۔

تین نسبتیں ہوتی ہیں: انعکاسی، القائی اور اصلاحی۔ انعکاسی نسبت بہت مؤثر ہے لیکن یہ وقتی طور پر مؤثر ہوتی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ہیٹر کے سامنے کھڑے ہوں تو گرم ہو جاتے ہیں، ہیٹر سے دور ہوئے تو ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ آئینہ کے سامنے کھڑے ہوں، تو آئینہ میں تصویر نظر آتی ہے، آئینہ کے سامنے سے ہٹ گئے تو کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ اسی طرح انعکاسی نسبت میں آدمی اپنے شیخ پر انحصار کرتا ہے۔ اس کے بعد القائی نسبت ہے۔ القائی نسبت یہ ہوتی ہے کہ آپ کو کوئی ایسا طریقۂ کار بتا دیا جائے کہ آپ خود سے کام شروع کر لیں۔ کام شروع کرنے کے بعد آپ کو فائدہ ہونے لگ جائے تو یہ القائی نسبت ہے۔ تیسری نسبت اصلاحی نسبت ہے۔ اصلاح نسبت سے مراد یہ ہے کہ سلوک طے ہو جائے پھر اصلاح ہو جائے۔ یہ نسبت اصل ہے۔

پہلے وقتوں میں صحبت کو حاصل کرنا آسان تھا۔ لوگ اس کے لئے اپنے آپ کو فارغ کر سکتے تھے۔ آج کل مصروفیات اتنی زیادہ ہیں کہ بعض دفعہ بالکل صحبت کا موقع ہی نہیں ملتا۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے تقریباً پورے ہندوستان کے لوگ بیعت تھے۔ اب سب لوگ تو حضرت کے پاس نہیں جا سکتے تھے۔ ان کا رابطہ خط کے ذریعہ سے ہوتا تھا۔ یقین جانئے کہ جو حضرات خط لکھتے تھے وہ خود فرماتے تھے کہ ہمیں پتا چل جاتا تھا کہ ہمارا خط پہنچ گیا ہے۔ کیونکہ جیسے ہی حضرت کو خط پہنچ جاتا ہماری حالت تبدیل ہو جاتی۔ یہ حضرت کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق تھا جس تعلق کی بنیاد پر ان مریدین کی حالت تبدیل ہو جاتی۔ یوں سمجھ لیجئے کہ اِس دور کے لئے اللہ پاک نے ایک خصوصی کرم فرمایا ہے۔ یہ عمومی طریقہ نہیں ہے۔ عمومی طریقہ وہی صحبت والا ہے۔ زیادہ فائدہ تو اُسی میں تھا۔ لیکن آج کل حالات ایسے ہیں کہ سب سے پہلی ترجیح تو ایمان بچانا ہے۔ ایک

شخص کو کسی شیخ کے ساتھ تعلق ہے اس تعلق کی برکت سے ایمان ہی بچ جائے تو بہت بڑی بات ہے۔

ایک مرتبہ میں نے باقاعدہ ارادہ کر لیا کہ اب کسی کو بیعت نہیں کروں گا۔ بھلا اتنے سارے لوگوں کی اصلاح کون کر سکتا ہے۔ بس جتنے ہیں وہی قابو آجائیں تو بڑی بات ہے۔ میں نے اپنے طور پہ ارادہ کر لیا۔ اس کے کچھ دن بعد ایک صاحب کو ہمارے شیخ حضرت مولانا اشرف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت ہوئی۔ ان کے توسط سے حضرت نے مجھے پیغام بھیجا کہ بیعت کرنا نہ چھوڑو۔ کم از کم لوگوں کا ایمان تو بچ جائے گا۔ اس سے پتا چل گیا کہ واقعی سلسلوں میں آنے سے ایمان بچ جاتا ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں، بہت بڑی بات ہے کہ کم از کم ایمان تو بچ جائے گا۔ اس کے بعد جو جتنا زیادہ تعلق رکھے گا اسے اتنا زیادہ فائدہ ہو گا۔

ہم نے جرمنی میں دو سال کے قیام کے دوران اس بات کا بخوبی مشاہدہ کیا ہے کہ جب تک ہم جرمنی میں تھے ہمیں اپنے شیخ حضرت مولانا اشرف سلیمانی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ تعلق زیادہ محسوس ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شاید وہ دُور تھے اس لئے ان کی قدر زیادہ محسوس ہوتی تھی یا کوئی اور وجہ تھی، ہمیں واضح طور پر معلوم نہیں لیکن ہم ایسا محسوس کرتے تھے جیسے ہم حضرت کے ساتھ ہیں۔ ہم لوگ حضرت کا فیض باقاعدہ محسوس کرتے تھے۔ یہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے کہ بعض احوال کے مطابق کچھ خاص انتظامات کر لئے جاتے ہیں۔ اگر آج کل اس قسم کی بات ہو تو اس پہ ہم اعتراض نہیں کریں گے۔ البتہ سب سے اعلیٰ طریقہ وہی ہے کہ فیضِ صحبت سے اس کا اجرا ہو، اس کے بعد آہستہ آہستہ بڑھتا رہے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ دفتر اول کے مکتوب نمبر 39 میں ارشاد فرماتے ہیں:

متن:

کام کادار و مدار دل پر ہے، اگر دل حق سبحانہٗ وتعالیٰ کے غیر کے ساتھ پھنسا ہوا ہے تو خراب اور ابتر ہے محض ظاہری اعمال اور رسمی عبادتوں سے کوئی کام نہیں بنتا، اللہ تعالیٰ کے غیر کی طرف التفات کرنے سے دل کو بچانا اور اعمالِ صالحہ جو بدن سے تعلق رکھتے ہیں اور شریعت نے ان کے بجا لانے کا حکم دیا ہے یہ دونوں امور ضروری ہیں، بدنی اعمالِ صالحہ کے بجالانے کے بغیر دل کی سلامتی کا دعویٰ کرنا باطل ہے۔

تشریح:

یعنی اگر کوئی شخص شریعت کے اعمال نہیں بجالاتا اور کہتا ہے کہ میرا دل پاک ہے تو اس کا یہ دعویٰ باطل ہے۔ جیسے آج کل بعض بے پردہ عورتوں کو پردہ کرنے کی ترغیب دی جائے تو کہتی ہیں کہ اصل پردہ تو دل کا ہوتا ہے۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی؟ پردہ دل کا کیسے ہوتا ہے؟ دل تو ویسے ہی پردہ میں ہے۔ اس کو کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اصل پردہ تو چہرے اور جسم کا ہے۔ لیکن شاعروں نے ان کو یہ طریقے سکھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ شاعر لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ شریعت پر عمل کئے بغیر دل کی حفاظت ناممکن ہے۔ شریعت پر چلتے ہوئے دل کو پاک کرنا اس کے اندر جان ڈالنے کے مترادف ہے۔ جب تک آپ کا دل اللہ کے ساتھ نہیں لگا ہوتا تب تک آپ کے اعمال میں جان نہیں ہوتی۔ وہ بے جان ہوتے ہیں۔

متن:

جس طرح اس دنیا میں بغیر بدن کے روح کا ہونا متصور نہیں ہے اسی طرح بدنی نیک اعمال کے بغیر دل کے احوال کا حاصل ہونا محال ہے، بہت سے ملحد (بے دین و گمراہ لوگ) اس زمانے میں اس قسم کے دعوے کرتے ہیں۔ **نَجَّانَا اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ عَنْ مُعْتَقَدَاتِهِمُ السُّوءِ بِصَدَقَةِ حَبِيْبِهٖ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ وَالتَّحِيَّةُ** (اللہ تعالیٰ اپنے حبیب علیہ الصلواۃ والسلام والتحیۃ کے صدقہ ہم کو ان کے ان برے اعتقادات سے نجات بخشے)۔

سیر و سلوک سے مقصود دلی امراض کا دور کرنا ہے:

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ دفتر اول کے مکتوب نمبر 40 میں فرماتے ہیں:

متن:

پس سیر و سلوک و تزکیہ نفس و تصفیہ قلب سے مقصود ان باطنی آفتوں اور قلبی امراض کو دور کرنا ہے جن کی طرف آیت کریمہ ﴿**فِي قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ**﴾ (بقرہ:10) (ان کے دلوں میں مرض ہے) میں خبر دی گئی ہے تاکہ ایمان کی حقیقت حاصل ہو جائے اور ان امراض و آفات کے موجود ہوتے ہوئے اگر ایمان حاصل ہے تو وہ صرف ظاہر کے اعتبار سے ہے۔

تشریح:

یہاں پر ایک باریک نکتہ ہے کہ دل محبت و نفرت، ایمان و کفر اور اخلاقِ حسنہ و اخلاق قبیحہ کی جگہ ہے۔ جبکہ نفس احساسات و خواہشات اور فجور و تقویٰ کے پیدا ہونے کی جگہ ہے۔ نفس ہی

اخلاص میں رکاوٹ ہے۔ اگر آپ یہ رکاوٹ دور کر لیں تو اخلاص پیدا ہو جائے گا۔ مثلاً میرا یہ چاہنا کہ لوگ مجھے اچھا کہیں۔ یہ خواہش نفس سے پیدا ہو رہی ہے۔ اگر میں اپنے نفس میں اس خواہش کو نہ آنے دوں اور اس سے بچ جاؤں۔ اگر میں فجور سے اپنے آپ کو بچاؤں اور تقویٰ کی طرف آ جاؤں۔ اور اس عمل کو مسلسل جاری رکھوں تو میرا نفس نفسِ مطمئنہ ہوتا چلا جائے گا۔ تقویٰ دل میں محفوظ ہوتا ہے۔ دل تقویٰ کی جگہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **"اَلتَّقْوٰی هٰهُنَا اَلتَّقْوٰی هٰهُنَا"**۔ (صحیح مسلم: 6541) اور دل کی طرف اشارہ کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تقوی نفس میں پیدا ہوتا ہے اور دل میں محفوظ ہوتا ہے۔ اسی طرح فجور نفس میں پیدا ہوتا ہے اور اس کا اثر دل پر ہوتا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کا اثر ایک دھبے کی صورت میں اس کے دل پر آ جاتا ہے۔ اس کے دل پر سیاہ دھبہ لگ جاتا ہے۔ اگر وہ توبہ کر لے تو وہ دھبہ دور ہو جاتا ہے اور اگر توبہ نہیں کرتا تو وہ دھبہ رہ جاتا ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی اور گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک اور دھبہ لگ جاتا ہے۔ اگر وہ گناہ کرتا جائے اور اس کے دل پر سیاہ دھبے بڑھتے جائیں تو عین ممکن ہے کہ کسی وقت اس کا سارا دل سیاہ ہو جائے۔ ایسی صورت میں اس پہ حق بات اثر ہی نہیں کرے گی۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا﴾ (الاعراف: 179)

ترجمہ: "ان کے پاس دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں"۔

﴿وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ﴾(البقرۃ:88)

ترجمہ: ''اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ: ہمارے دل غلاف میں ہیں''۔

ایسے لوگ جو گناہ در گناہ کرتے چلے جاتے ہیں اور توبہ نہیں کرتے ان کا دل اتنا سیاہ ہو چکا ہوتا ہے کہ اس میں حق بات کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ اگر کسی کے ساتھ ایسی صورت حالت ہے تو اسے ایک زبردست جھٹکے کی ضرورت ہے۔ جیسے دل کا مریض جسے دل کا دورہ پڑے، اس کا دل بند ہو جائے تو اسے ایک جھٹکا لگاتے ہیں۔ کبھی ہاتھ سے جھٹکا لگاتے ہیں اور کبھی بجلی کا جھٹکا بھی دیتے ہیں۔

ایک ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ میرے پاس ایک مریضہ انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اچانک اسے دل کا دورہ پڑا اور وہ نیچے گر گئی۔ میرے پاس اس وقت آپریشن کرنے کے ذرائع اور آلات موجود نہیں تھے۔ میں نے پیر کا انگوٹھا اس کے دل پر رکھ کر زور سے جھٹکا دیا۔ اس کا دل چل پڑا لیکن اس کی 2 پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ اس کے بیٹوں نے مجھ پر دعویٰ کر دیا کہ اس ڈاکٹر نے ہماری والدہ کی 2 پسلیاں توڑ دی ہیں۔ میں نے کہا کہ عدالت میں چلے جاؤ۔ مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔ میں یہی کہوں گا کہ آپ کو ثابت پسلیوں کے ساتھ والدہ کی لاش چاہئے تھی یا ٹوٹی ہوئی پسلیوں کے ساتھ زندہ ماں چاہئے تھی۔ میرے پاس اس وقت آلات وغیرہ نہیں تھے، میں یہی کر سکتا تھا اس لئے میں نے یہی کیا۔

خیر! یہ جھٹکا لگانا ہی ہوتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ جھٹکا قرآن پاک سے لگا۔ اس کے بعد عمر، وہ عمر نہیں رہا۔ وہ تبدیل ہو گیا۔ اگرچہ قرآن سن کر وہ فوری طور پر مسلمان نہیں ہوئے لیکن تبدیل ہو چکے تھے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے ان کے پاس لے جاؤ۔ انہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے جایا گیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گھبرا گئے۔ ان کو پتا تھا کہ عمر تو ایسے ہیں۔

امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ آنے دو اگر صحیح ارادہ سے آیا ہے تو ٹھیک، ورنہ انہی کی تلوار سے ان کا سر قلم کر دوں گا۔ جس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ اندر آئے تو آپ ﷺ نے ان کے کپڑے کو جھٹکا دیا اور پوچھا: ''کس ارادہ سے آئے ہو؟'' کہا: ''ایمان لانے کے لئے''۔

اس جھٹکے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ کسی اللہ والے کے قلب کا اثر ہوتا ہے۔ بعض اوقات خاص ماحول کا اثر ہوتا ہے جس سے دل پہ پڑے ہوئے پردے پھٹ جاتے ہیں اور وہ پیغام اندر گھس جاتا ہے۔ پھر ایسے شخص پہ دوبارہ حق بات کا اثر ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

دل کی غیر اللہ سے رہائی کے لئے اتباع سنت سب سے بہتر ہے:

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ دفتر اول کے مکتوب نمبر 42 میں ارشاد فرماتے ہیں:

متن:

انسان جب تک پراگندہ تعلقات کی مَیل کچیل سے آلودہ ہے (محبوبِ حقیقی سے) محروم اور مہجور (جدا) ہے۔ حقیقتِ جامع (دل) کے آئینہ کو غیر اللہ کی محبت کے زنگ سے صاف کرنا ضروری ہے، اور اس زنگ کو دُور کرنے کے لئے سب سے بہتر مصقلہ (زنگ دُور کرنے والی چیز) حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روشن و بلند سنت کی پیروی کرنا ہے۔ اتباعِ سنت کا دار و مدار نفسانی عادتوں کے ہٹانے اور ظلمانی رسموں کے دور کرنے پر ہے۔

تشریح:

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں ایک بہت بڑی بات فرمائی ہے کہ اصل میں اصلاح کی ابتدا ذکر سے ہوتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث شریف ہے کہ ہر چیز کے لئے

ایک صِقالہ ہے اور دلوں کے لئے صقالہ ذکرُاللہ ہے۔ اصلاح کی ابتدا ذکر سے ہوتی ہے جبکہ بعد میں اصل اصلاح سلوک طے کرنے سے ہوتی ہے۔ اب سلوک کون سے طریقہ سے طے کیا جائے۔ نقشبندی تحقیق یہ ہے کہ سنت اعمال میں جو مجاہدہ ہے اس مجاہدہ کو برداشت کیا جائے۔ جیسا کہ میں نے ان صاحب سے کہا تھا کہ کچھ بھی ہو آپ نے فجر کی نماز ضرور پڑھنی ہے۔

آج کل میں اکثر عرض کیا کرتا ہوں کہ خدا کے بندو! اس وقت اللہ پاک نے آپ کو ترقی کرنے کا بہت اچھا موقع دیا ہے۔ فجر کی نماز کو تکبیر اولیٰ کے ساتھ پڑھا کرو۔ اس سے آپ کے اتنے مجاہدات ہو جائیں گے کہ آپ بہت آگے چلے جائیں گے کیونکہ اس وقت راتیں چھوٹی ہیں فجر کی نماز آسانی سے پڑھی جاسکتی ہے۔ واقعتاً فجر کی نماز پڑھنا کوئی آسان بات نہیں ہے بہت بڑا مجاہدہ ہے لیکن جو اس مجاہدہ کے لئے تیار ہو گیا، اس نے اَڑی نہیں کی اور اپنے نفس کو قابو رکھا۔ تو ان شاءاللہ سارا قناعت و ریاضت کا رستہ اسی میں طے کر لے گا۔

اصل مقصد نفس کو قابو کرنا ہے۔ سوال یہ ہے کہ نفس کو قابو کرنے کا اصل گر کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر نفس کی ایک مانو گے تو یہ مزید منوائے گا اور اگر اس کو منواؤ گے تو یہ مانتا چلا جائے گا۔ یہ نفس کا اصول ہے کہ اگر اس کو منواؤ گے تو مانتا جائے گا اور اگر اس کی مانو گے تو مزید منواتا جائے گا۔

سنت ہمارے لئے پوری زندگی میں ہے۔ ہر ہر رخ میں سنت موجود ہے۔ آپ صبح اٹھتے ہیں تو اٹھتے ہی سنتیں شروع ہو جاتی ہیں اور لیٹنے تک سنتیں چل رہی ہوتی ہیں۔ اگر آپ ہر کام سنت کے مطابق کریں تو یہ نفس کے لئے بہت بڑا مجاہدہ ہے۔ اگر آپ یہ مجاہدہ کرتے رہیں تو اسی کے ذریعہ

آپ کی اصلاح ہو جائے گی۔

آج کل میں دیکھتا ہوں کہ ایک خاندان میں داڑھی رکھنے کی عادت ہی نہیں ہے۔ اس میں جب کوئی داڑھی رکھے گا تو اسے کتنا مجاہدہ کرنا پڑے گا۔ وہ جتنا مجاہدہ برداشت کرے گا اس کی اتنی ہی زیادہ اصلاح ہو گی۔ اسی طرح اگر کسی خاندان میں عورتوں کے پردہ کا رواج نہیں ہے۔ ایسے خاندان میں جو عورت پردہ کرے گی اسے بہت باتیں سننا پڑیں گی۔ جب بھی وہ کچھ عورتوں کے ساتھ بیٹھے گی تو اسے ان کی باتیں جھیلنی پڑیں گی۔ کسی گھر میں ٹی وی ہے اور اس سے بچنا ہے تو یہ بہت بڑا مجاہدہ ہو گا کہ پاس ہی کوئی آدمی ٹی وی دیکھ رہا ہے لیکن آپ نہیں دیکھ رہے۔ ان سب مجاہدوں سے مجاہدہ کرنے والے کو بہت فائدہ ہوتا ہے۔

مجھے بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت ہم سے ذکر نہیں ہوتا کیونکہ ہمیں ذکر میں یکسوئی حاصل نہیں ہوتی اور ذکر کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ مسلسل خیالات آتے رہتے ہیں۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ اگر آپ کا دل چاہے اور آپ ذکر کریں تو اس میں صرف دل کا فائدہ ہے اور اگر آپ کا دل نہ چاہے پھر بھی ذکر کریں تو اس میں دل کا فائدہ بھی ہے اور نفس کی اصلاح بھی ہے۔ اس میں دونوں فائدے ہیں لہٰذا آپ دونوں فائدوں کو حاصل کریں۔ بلکہ جس وقت جی نہ چاہے تب تو والہانہ انداز میں ذکر کریں۔ یہ سوچ کر خوب توجہ اور شوق سے ذکر کریں کہ اس وقت ذکر کرنے میں دونوں چیزوں کا فائدہ ہے۔ نفس کی بھی اصلاح ہے اور دل کی اصلاح بھی ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی بات فرمائی ہے کہ نفس کی اصلاح نفسانی عادتوں کے ہٹانے اور ظلمانی رسموں کے دور کرنے پر موقوف ہے۔ مثلاً شادی کی فضول رسموں سے بچتے

ہوئے سنت کے مطابق شادی کرنا۔ فوتگی کے موقع پر سنت کے مطابق عمل کرنا۔ گھر میں رہن سہن سنت کے مطابق اختیار کرنا۔ مثلاً سالگرہ کی رسم کو دیکھ لیں۔ آج کل بڑے دین دار گھرانوں میں یہ رسم ہے۔ جو لوگ یہ رسم نہیں کرتے انہیں بہت ساری باتیں سننی پڑتی ہیں۔ یہ ان کے لئے بہت بڑا مجاہدہ ہے۔ اگر اس نے یہ مجاہدہ برداشت کر لیا تو اس کی اصلاح ہو جائے گی۔

صوفی کائن بائن اور حسنات الابرار سیئات المقربین کی تشریح:

حضرت دفتر اول مکتوب نمبر 24 میں ارشاد فرماتے ہیں:

متن:

''**اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ**'' (آدمی اسی کے ساتھ ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے) پس وہ شخص مقبول و برگزیدہ ہے جس کے دل میں حق سبحانہ و تعالیٰ کے ساتھ محبت کے سوا کسی اور کی محبت باقی نہ رہی ہو، اور وہ ذات تعالیٰ و تقدس کے سوا کسی اور کا طالب نہ ہو۔ پس ایسا شخص اللہ جلّ جلالہٗ کے ساتھ ہے اگرچہ وہ بظاہر مخلوق کے ساتھ مشغول ہے اور یہ کائن بائن صوفی کی شان ہے یعنی حقیقت میں وہ حق تعالیٰ شانہٗ کے ساتھ واصل اور مخلوق سے جدا ہے۔

تشریح:

بائن سے مراد یہ ہے کہ وہ جدا ہے اور کائن سے مراد یہ ہے کہ ملا ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ واصل ہے اور مخلوق سے جدا ہے۔

متن:

یا اس سے یہ مراد ہے کہ ظاہر میں مخلوق کے ساتھ ہے اور حقیقت میں مخلوق سے جُدا ہے۔

تشریح:

یہ کام سب کو کرنا پڑتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک شخص لوگوں کے ساتھ رہنے کی ایذائیں برداشت نہیں کرتا، علیحدہ خلوت میں رہتا ہے۔ دوسرا آدمی لوگوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے مخلوق کی ایذائیں برداشت کرتا ہے تو یہ دوسرا شخص پہلے سے افضل ہے۔ کیونکہ اس کو ان ایذاؤں کی وجہ مسلسل روحانی ترقی حاصل ہو رہی ہے۔ یہ لوگوں کے ساتھ ہے لیکن حقیقت میں اللہ کی طرف متوجہ ہے۔ لوگ اس کو دنیادار سمجھتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ دنیادار نہیں ہوتا۔

ایک مرتبہ حکیم اختر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نواب قیصر صاحب کے ہمراہ تشریف لائے تھے۔ حضرت نے بیان کے دوران فرمایا کہ نواب قیصر صاحب کی مرسیڈیز کو نہ دیکھیں۔ جس وقت برف پانی ہو جائے تو وہ پانی کے حکم میں ہوتی ہے۔ پھر برف کے حکم میں نہیں رہتی۔ لہٰذا اب یہ (نواب قیصر) مرسیڈیز میں بیٹھتا ہے مگر مرسیڈیز اس کے دل میں نہیں ہے۔

حضرت اورنگزیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ بادشاہ تھے۔ تخت پر بیٹھتے تھے۔ تاج پہنتے تھے۔ شاہی لباس پہنتے تھے لیکن یہ سب دربار میں ہوتا تھا۔ گھر میں ان کا وہی جوڑا ہوتا تھا جو انہوں نے خود سیا ہوتا تھا۔ قرآن پاک لکھ کر اور ٹوپیاں سی کر جو پیسے کمائے ہوتے تھے ان سے سوت خرید کر اس سے اپنے کپڑے سیتے تھے اور گھر میں وہی پہنتے تھے۔ گھر میں ان کا معاملہ الگ ہوتا تھا۔ اگر کوئی پوچھتا کہ حضرت آپ ایسا کیوں کرتے ہیں تو فرماتے کہ یہ تو وردی ہے۔ میں دربار میں آتا ہوں تو وردی کے طور پر یہ لباس پہنتا ہوں۔ باقی میری اصل حقیقت وہی ہے۔ جو قرآن شریف خود لکھتے تھے وہ بہت دور دراز کے ایسے علاقوں میں بھجواتے تھے جہاں کے لوگوں کو یہ معلوم نہ ہو سکتا کہ یہ قرآن مجید کے نسخے

انہوں نے لکھے ہیں، اس کی وجہ یہ ہوتی تھی کہ لوگ ان نسخوں کو گراں قیمتوں پر نہ لیں۔ یہ حضرات اگرچہ لوگوں کے ساتھ تھے لیکن ان کے دل لوگوں کے ساتھ نہیں بلکہ اللہ کے ساتھ ہوتے تھے۔

متن:

اور قلب کی محبت کا تعلق ایک سے زیادہ کے ساتھ نہیں ہوتا پس جب تک اس کی محبت کا تعلق اس ایک (ذات) سے ہو گا اس کے علاوہ قلب کو کسی سے محبت نہیں ہو گی اور یہ جو اس کی خواہشات کی کثرت اور بے شمار چیزوں کے ساتھ اس کی محبت کے تعلق کا متعدد ہونا (مثلاً مال، اولاد، سرداری، تعریف اور لوگوں میں بلند مرتبہ ہونا) دیکھا جاتا ہے تو اس کے باوجود (بھی اس کا محبوب ایک ہی ہو گا اور وہ اس کا اپنا نفس ہے۔

تشریح:

یعنی ہر چیز نفس کی طرف آ رہی ہے کیوں کہ نفس اس چیز کو چاہ رہا ہے۔ لہٰذا اصل میں تو اس کو نفس کے ساتھ محبت ہے۔

متن:

اور ان سب چیزوں کی محبت اس کے اپنے نفس کی محبت کی فرع (شاخ) ہے اس لئے کہ وہ ان چیزوں کو اپنے نفس ہی کے لئے چاہتا ہے، فی نفسہٖ ان اشیاء کو نہیں چاہتا، پس جب اس کو اپنے نفس کے ساتھ محبت نہیں رہے گی تو ان چیزوں کی محبت بھی اس کے نفس کے تابع ہونے کی وجہ سے دُور ہو جائے گی اسی لئے کہتے ہیں کہ بندہ اور حق سبحانہٗ وتعالیٰ کے درمیان حجاب، بندہ کا اپنا نفس ہے نہ کہ دنیا۔ کیونکہ دنیا فی نفسہ بندہ کا مقصود نہیں ہے جو وہ حجاب بنتی، بلکہ بے شک بندہ کا مقصود اس کا اپنا

نفس ہی ہے تو لازمی طور پر بندہ (کا نفس) خود حجاب ہے نہ کہ اس کے سوا کوئی اور چیز، پس جب تک بندہ اپنے نفس کی خواہش سے پوری طرح خالی نہیں ہو گا حق تعالیٰ اس کی مراد نہیں ہو سکتا، اور حق سبحانہٗ کی محبت اس کے قلب میں نہیں سما سکتی، اور یہ اعلیٰ درجہ کی دولت فنائے مطلق کے بعد ہی متحقق ہوتی ہے جو کہ تجلئ ذاتی پر موقوف ہے، کیونکہ ظلمات (اندھیروں) کا پوری طرح دُور ہونا اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک سورج طلوع ہو کر پوری طرح روشن نہ ہو جائے۔

پس جب یہ محبت جس کو محبتِ ذاتیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے حاصل ہو جاتی ہے تو مُحِبّ کے نزدیک محبوب کا انعام اور رنج والم دینا یکساں ہو جاتا ہے۔

تشریح:

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس عبارت میں ایک بہت بڑے مقام کی تشریح فرمائی ہے۔ انسان جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے اللہ تعالیٰ ویسے ویسے اس پہ چیزیں کھولتے جاتے ہیں۔ محبتِ ذاتی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ محبت ہو۔ ایک ذات کے ساتھ محبت ہوتی ہے اور ایک صفات کے ساتھ محبت ہوتی ہے۔ ہماری پہلی نظر صفات پر پڑتی ہے۔ اللہ کو تو کسی نے نہیں دیکھا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات وراء الوریٰ ہے۔ اسے دیکھ تو کوئی نہیں سکتا البتہ اس کی صفات کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً اللہ پاک کریم ہیں۔ اللہ پاک رزاق ہیں۔ اللہ جل شانہٗ غفور ہیں۔ اللہ پاک رحیم ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ کی یہ صفات اس پر منکشف ہو رہی ہیں۔ یہ انکشاف اس کے لئے محبت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ یہ شخص جب اس محبت میں ترقی کرتا ہے تو صفت میں فنا ہو رہا ہوتا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے اس کو وسیع رزق دیا ہوا ہے تو یہ بڑا خوش ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑا رزاق ہے اور اسے اللہ تعالیٰ کے ساتھ

بڑی محبت ہے۔ یہ فنافی الرزاقیت ہے فنافی اللہ نہیں ہے۔ فنافی اللہ اُس وقت قرار دیا جائے گا جب اللہ پاک اس کا رزق کھینچے گا اور اس کے اوپر پریشانی آئے گی۔ اگر اس کی محبت پھر بھی باقی رہے تب پتا چلے گا کہ اس کی فنافنافی الرزاقیت نہیں ہے۔ بہت سارے لوگ خوشی کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی تعریفیں کرتے ہیں مگر جب مشکل آتی ہے تو ناشکری کی باتیں کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگ صفت میں فنا ہیں ذات میں فنا نہیں ہیں۔ لیکن جس خوش قسمت کو اللہ تعالیٰ کی ذات میں فنا نصیب ہو جاتی ہے بے شک کچھ بھی ہو جائے وہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہی فدا ہوتا ہے۔ اسے کسی خاص شرط اور کسی خاص حالت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ غور کریں کہ اگر انسان کو کسی دوسرے انسان کے ساتھ عشق ہو جائے تو وہ کسی خاص شرط پر منحصر نہیں ہوتا بلکہ بلا شرط اس سے محبت کرتا ہے۔ اسی طرح اگر اللہ کے ساتھ کسی کو سچی محبت ہو جائے تو پھر مشکل اور آسانی میں فرق نہیں ہوتا۔ تعریف اور مذمت میں فرق نہیں ہوتا۔ اگر لوگ اس پہ ٹماٹر پھینک رہے ہوں، غصہ کر رہے ہوں اور تھوک رہے ہوں پھر بھی وہ اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ وہ اس تکلیف اور پریشانی کی حالت کو امتحان سمجھتا ہے۔

جب تک محبتِ ذاتی نصیب نہ ہو اس وقت فنافی اللہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اور جب تک کوئی فنا فی اللہ نہیں ہوا اس وقت تک وہ چیز حاصل نہیں ہو سکتی جس کا حضرت نے ذکر کیا ہے۔

متن:

اور وہ حق تعالیٰ سبحانہٗ کی عبادت خاص اسی کے لئے کرتا ہے اپنے نفس کے لئے نہیں کرتا یعنی وہ عبادت اپنے اوپر انعام طلب کرنے اور اپنے آپ سے رنج والم دور کرنے کے لئے نہیں کرتا کیونکہ

یہ دونوں اس کے نزدیک برابر ہیں اور یہ مرتبہ مقربین کے لئے مخصوص ہے کیونکہ ابرار محبتِ ذاتیہ کی سعادت سے کامیاب نہ ہونے کے باعث حق سبحانہٗ وتعالیٰ کی عبادت خوف اور طمع کے لئے کرتے ہیں اور یہ دونوں (یعنی خوف و طمع) ان کے اپنے نفسوں کی طرف راجع ہیں۔

تشریح:

خوف بھی نفس کی طرف ہے اور طمع بھی نفس کی طرف ہے۔

متن:

پس لامحالہ (بالضرور) ابرار کی نیکیاں مقربین کی نسبت سے برائیاں ہیں۔

تشریح:

جیسے کہتے ہیں: "**حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْنَ**"۔

متن:

لہذا ابرار کی نیکیاں ایک لحاظ سے برائیاں ہیں اور ایک لحاظ سے نیکیاں، اور مقربین کی نیکیاں خالص اور محض نیکیاں ہیں۔

تشریح:

حضرت کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات "مقاماتِ قطبیہ و مقالاتِ قدسیہ" میں ایک واقعہ ذکر کیا گیا ہے کہ ایک صاحب بہت تکلیف میں تھے۔ کسی نے ان کو دیکھا تو اس کا دل بڑا پسیجا کہ یہ کس حالت میں ہیں۔ تو ان صاحب نے اسے گھور کے دیکھا اور کہا کہ اے مکلف! میرے اور اللہ کے درمیان نہ آنا۔ اگر اللہ پاک مجھے ٹکڑے ٹکڑے بھی کر دے تو پھر بھی وہ میرا اللہ ہے۔ آپ کو

درمیان میں آنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ مقربین والا مقام ہے۔ یقین جانیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہی بات تھی۔ وہ شہید ہو رہے ہیں تو کہہ رہے ہیں **"فُزْتُ بِرَبِّ الْكَعْبَةِ"**۔ "ربِ کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا"۔ کافر حیران ہوتے تھے کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں اس کو مار رہا ہوں یہ جان قربان کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا۔ یہ مقربین کی بات ہے۔

متن:

ہاں مقربین میں سے بعض وہ ہیں جو بقائے اکمل کے حصول اور عالمِ اسباب میں نزول ثابت ہونے کے بعد بھی خوف اور طمع کی وجہ سے حق سبحانہٗ وتعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں لیکن ان کا خوف اور طمع اُن کے اپنے نفسوں کی طرف راجع نہیں ہوتا، بلکہ بلاشبہ وہ حق سبحانہٗ وتعالیٰ کی عبادت اس کی رضامندی کی طمع کرتے ہوئے اور اس کے غضب و ناراضگی سے ڈرتے ہوئے کرتے ہیں۔

تشریح:

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیمار تھے اور رو رہے تھے۔ کسی نے کہا: حضرت آپ بھی اس طرح کرتے ہیں؟ فرمایا: کیا میں اللہ پاک کو اپنی پہلوانی دکھاؤں؟ اللہ پاک نے مجھے بیمار اس لئے کیا ہے تاکہ میں اپنی عاجزی دکھاؤں۔ دیکھئے ان کی طرف سے اس حالت میں رونا تو تھا لیکن یہ رونا تکلیف کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی ظاہر کرنے کے لئے تھا۔ یہ طمع یا خوف دونوں اللہ کے لئے ہیں۔ کیونکہ اللہ ہم سے یہ چاہتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہم ایسا کریں تو

ہم ضرور کریں گے۔

متن:

اور اسی طرح وہ بے شک جنّت کو اس لئے طلب کرتے ہیں کہ وہ حق سبحانہٗ و تعالٰی کی رضامندی وخوشنودی کا مقام ہے نہ کہ اپنے نفس کی لذت کے لئے۔اور وہ دوزخ سے اس لئے پناہ مانگتے ہیں کہ وہ حق سبحانہٗ وتعالٰی کے غضب وناراضگی کی جگہ ہے نہ کہ اپنے نفسوں سے اس کے رنج و الم کو دور کرنے کے لئے کیونکہ یہ اکابر اپنے نفسوں کی غلامی سے آزاد ہو چکے ہیں اور محض حق سبحانہٗ وتعالٰی ہی کے لئے مخصوص ہو گئے ہیں اور مقربین کے مرتبوں میں یہ مرتبہ سب سے اعلٰی ہے۔ اور اس مرتبہ والے بزرگ کو مرتبۂ ولایتِ خاصہ کے حصول کے بعد مقامِ نبوت کے کمالات میں سے پورا پورا حصہ حاصل ہو جاتا ہے۔اور جو شخص عالم اسباب کی طرف نزول نہیں کرتا وہ اولیائے مستہلکین (مغلوب الحال اولیاء) میں سے ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ O

مقاماتِ قطبیہ و مقالاتِ قدسیہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ O

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ O

حضرت شیخ عبدالحلیم رحمۃ اللہ علیہ (جو حلیم گل بابا کے نام سے مشہور ہیں) کی کتاب ''مقالات قدسیہ و مقامات قطبیہ'' (جو حضرت کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ہے) سے تعلیم جاری ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس وقت اس کتاب کی تعلیم حرم شریف سے ہو رہی ہے۔ گزشتہ درس میں حضرت کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی نماز کے بارے میں بات ہوئی تھی۔

آج اس سے آگے پڑھیں گے۔

متن:

''اَلْأَمْثَالُ مَصَابِیْحُ الْأَقْوَالِ'' یعنی مثالیں باتوں کے ستارے ہوتی ہیں۔

''اَلْأَنْبِیَاءُ یُصَلُّوْنَ فِیْ قُبُوْرِھِمْ'' (میزان الاعتدال بتغییر یسیر، رقم الصفحۃ: 1/460، مکتبہ: دار المعرفۃ، بیروت) ''انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں نماز ادا کرتے ہیں''۔ یہ صورتاً ظاہری طور پر موت ہے اور باطنی طور پر زندگی ہے۔

تم نے طہارت کی تشریح سُن لی، اب نیت کے اسرار سُن لو۔ اے بھائی! اہلِ ظواہر نہیں جانتے کہ نیت کیا چیز ہوتی ہے۔ نیت کرنا بھی نماز کے لئے شرط ہے۔

نیت کرنا بھی نماز کے لئے شرط ہے۔ نماز تب درست ہوتی ہے، جب نیت صحیح اور درست

ہو، جیسا کہ فرما چکے ہیں کہ ''**إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ**''(الصحیح للبخاری، رقم الحدیث: 1)''اعمال کا دار و مدار نیتوں پر موقوف رہتا ہے''۔ اور عبید اللہ تشتری صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''**اَلنِّيَّةُ نُوْرٌ**'' یعنی نیت نور ہے، اور نیت کے حروف میں یہ نکتہ پوشیدہ ہے: ''**اَلنُّوْنُ إِشَارَةٌ إِلَى النُّوْرِ وَ الْيَاءُ إِشَارَةٌ إِلَى يَدِ اللهِ وَ التَّاءُ إِلَى هِدَايَةِ اللهِ وَ قِيْلَ: اَلتَّاءُ إِشَارَةٌ إِلَى تَايِيْدِ اللهِ بِالْهِدَايَةِ فَإِنَّ النِّيَّةَ نَسِيْمُ الرُّوْحِ فَرَوْحٌ وَّ رَيْحَانٌ وَّ جَنَّةُ النَّعِيْمِ**''۔ ''نون اشارہ ہے نور کی جانب، اور یاء اشارہ ہے ید اللہ، اللہ کے ہاتھ کی جانب، اور تاء اشارہ ہے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی جانب۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ تاء اشارہ ہے اللہ تعالیٰ کی تائید جو کہ ہدایت کی جانب ہو کیونکہ نیت روح کی خوشگوار ہوا، خوشبو اور نعمتوں سے بھر پور جنت ہے''۔ پس اے بھائی! اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے۔ اور نیت کوئی چیز نہیں ہوتی، لیکن اللہ تعالیٰ کا کرم وعطا ہوتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے خلعت ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ نے جناب حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی میت پر نماز جنازہ نہیں پڑھی، دوستوں نے اس پر اعتراض کیا کہ تم نے حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ پر نمازہ جنازہ نہیں پڑھی۔ بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا کہ ''**لَا أَجِدُ نِيَّةً**'' ''مجھے نیت حاصل نہیں تھی''۔ انہوں نے کہا کہ سب دوست مذکورہ نیت سے محروم تھے۔ پس نماز میں اس قسم کی نیت درکار ہوتی ہے تاکہ نماز ادا کی جا سکے۔ نیت کے بعد تکبیر کہنا ہے تاکہ نماز میں جو باطل سامنے ہو، سب کو آگ میں جلا ڈالے اور نماز

میں باطل کا شائبہ تک نہ رہے اور سب حق ہی حق رہ جائے۔ ﴿قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ﴾ (بنی اسرائیل:81) ''کہہ دو آیا سچ اور نکل بھاگا جھوٹ''۔

اے بھائی! پروانہ جو آگ کا عاشق ہے، جب وہ اپنے آپ کو آگ کے حوالے کرتا ہے اور آگ اس کو قبول کرتا ہے اور غیر کی نفی کرتا ہے، تو اس کو آگ ہی سے قوت حاصل ہوتی ہے، اور کسی غیر کے بغیر اُس کو اُس سے قوت حاصل ہوتی ہے۔

اے بھائی! میں نہیں جانتا کہ کیا لکھوں! یہ ایسا مقام ہے، جہاں زمان و مکان اُٹھ جاتے ہیں۔ پس محمد حسینؒ کے اِن اشعار پر غور کرنا چاہیئے۔

ابیات:

در فروغ آں یک نظر
محوے گردد قدم وجودم سر بسر

اش شعاع آفتاب فرشاہ
پاک بر خیزیم آن ساعت ز راہ

چو نمے ماند ز من نامِ وجود
چوں بخدمت پیش رقم در سجود

گر تو مے بینی مرا آن دم عیان
نیستم من ہست آں شاہ جہان

گفتم اکنون مے ندانم کسنیم
بندۂ باری نیستم پس چیشتم

مے ندانم تو منی یا من توئی
محو گشتم در تو و گم شد دوئی

''اُس ایک نظر کے نور اور روشنی سے میرا سارا وجود سراسر محو ہو جاتا ہے۔ بادشاہ کے دبدبے کی شعاعِ آفتاب کی وجہ سے میں اس وقت راہ پر سے اُٹھ جاتا ہوں۔ جب میرے وجود کا نام تک نہیں رہ جاتا، تو میں آپ کی خدمت میں سجدہ ریز کیسے ہوا؟ اگر تُو اس وقت مجھے دیکھتا ہے، تو میں نہیں ہوتا بلکہ وہ جہان کا بادشاہ موجود ہوتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ اب میں نہیں جانتا کہ میں کون ہوں۔ میں بندہ نہیں ہوں، تو پھر کیا ہوں؟ میں یہ نہیں جانتا کہ تُو، میں ہے یا کہ میں ''تم'' ہوں۔ میں تمہاری ذات میں محو ہو گیا اور دوئی درمیان سے مٹ گئی''۔

سمجھنے والے ان باتوں کو سمجھ پاتے ہیں۔ اے میرے محبوب! بس جس چیز کی جانب روح مائل ہو کر اس جانب کا رُخ کرے، وہی اس کا قبلہ ہوتا ہے۔ ﴿فَأَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ (البقرہ:115) ''سو جس طرف تو منہ کرو، وہاں ہی متوجہ ہے اللہ''۔ (شیخ الہند)

حاصلِ کلام یہ کہ جب بندہ اس مقام تک پہنچ جائے، جس تک کہ ہم آواز دیتے ہیں تو وہاں نہ دِن ہوتا ہے، نہ رات ہوتی ہے۔ ''لَيْسَ عِنْدَ اللّٰهِ صَبَاحٌ وَّلَا مَسَاءٌ'' ''اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہ صبح ہوتی ہے، نہ شام''۔ تو پھر پانچ وقتوں کو کیسے دریافت کرے گا؟ مگر جب یہ آیت

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلٰوتِهِمْ دَآئِمُوْنَ﴾ (المعارج:23) ''اور وہ لوگ جو اپنی نماز پر قائم ہیں''۔ اس گروہ کے بارے میں درست ہو۔ اس مقام پر شیخ محمد حسینؒ نے لکھا ہے کہ میں کیا کروں کہ دنیا کے حال سے بے خبر راستے کے بچوں کی طرح ہوں، اس کا بیان اور تشریح نہیں کر سکتا۔ لیکن تکبیر اس طرح کہنی چاہئے کہ تُو دونوں جہانوں کو محو سمجھے اور ﴿إِنِّيْ ذَاهِبٌ إِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ﴾ (الصافات:99) ''میں جاتا ہوں اپنے رب کی طرف، وہ مجھے راہ دے گا''۔ کے استقبال میں چلے اور مشاہدہ کرے کہ جس وقت ﴿إِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ﴾ (الانعام:79) کہے، تو محبوب کے رخِ زیبا کو اپنا مرکز سمجھے اور اس کو مرکز السمٰوت والارض تصور کرے اور اس مقام کو دیکھے کہ ﴿فَلَآ أُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ﴾ (الحاقۃ:38-39) ''سو قسم کھاتا ہوں اُن چیزوں کی جو دیکھتے ہو اور چیزیں کہ تم نہیں دیکھتے''۔ اور وہ مرکز دیکھے جو ''حَنِيْفًا'' ''مِلَّةَ إِبْرَاهِيْمَ'' کا مرکز ہے، اور ''مُسْلِمًا'' کہہ کر استغفار کہے۔ اس کے بعد ﴿إِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ (الانعام:62) کہ ''میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے، جو پالنے والا سارے جہان کا ہے''۔ اور ان سب کو تُو ظاہر اور عیاں دیکھے اور غیر کو شوق کی آگ سے جلتا ہوا کرے۔ اس کے بعد اے بھائی! ﴿وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ (الانعام:163) ''مجھے اس کا حکم دیا گیا ہے اور میں پہلا مسلمان ہوں''۔ کی مبارک آیت تم کو مسلمانی سکھائے۔ اس کے بعد ﴿أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ

الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ﴾ کہنا اس مقام پر درست ہوگا۔ اور ''بِسْمِ اللّٰہِ'' سے شروع کرنے کی ضرورت ہوگی۔ ''اَلرَّحْمٰنِ'' اور ''اَلرَّحِیْمِ'' اُس کی صفات ہیں جو کہ ذات کے ساتھ تعلق پذیر ہیں۔ پس اے بھائی! ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' شکر کرنا ہے، ''اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' اِس کے بعد ''رَبِّ الْعَالَمِیْنَ'' کی ذات کی صفات ہیں، جو بارِ دیگر توثیق اور مزید آرائش کے لئے ہیں۔ جیسا کہ ''اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' خوش نما اور زیبا ہے۔ اس کے بعد اے برادرِ عزیز! اللہ اور اِلٰہ ایک ہو جائیں گے۔ اس لئے ''اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' کا تکرار ضروری ہے۔ ''مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ'' یعنی دنیا کو دین کے آئینے میں دیکھے گا، کیونکہ آخرت کے لئے دنیا میں جگہ نہیں اور وہ اس میں سما نہیں سکتی۔ پس اے بھائی! سورۂ فاتحہ میں ساقی واسطہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) سے شراب مانگو گے، اور یہی کر کہ تجھے مستی اور دیوانگی ہو جائے اور ساقی واسطہ جناب رسالت پناہ ﷺ کی ذاتِ مبارک اور پیر تربیت ہے تو اے بھائی! اِسی ساقی واسطہ سے ساقی واسطہ تک پہنچ جاؤ گے۔ اور جب تم مست ہو جاؤ تو ''اِیَّاکَ نَعْبُدُ'' کہہ کر خدمت پر کمربستہ ہو جاؤ گے اور ''اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ'' تمہاری زبان سے نکل پڑے گا۔ اور تمہارے دونوں جہانوں کی تمنا بر آئے گی اور ''اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ'' کو بعینہ دیکھو گے کہ ساقی کے ہاتھ سے بغیر کسی واسطے کے شراب نوش کرتے ہیں۔ اور وہ لوگ کون ہیں، جو بلا واسطہ دستِ ساقی سے شراب نوش کرتے ہیں؟ وہ لوگ ''صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ'' ہیں۔ اور وہ لوگ جو کہ محروم ہیں اور جدائی

کے صدمے سہہ رہے ہیں، تم گھر کے اندر بیٹھ کے نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہو اور وہ زنجیر کے حلقے کی طرح باہر نکلے اور نکالے پڑے ہوئے ہیں۔ ''**غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ**'' ہیں، اس وقت تجھے معلوم ہو جائے گا کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اشارہ فرمایا ہے کہ ''**لَا صَلٰوةَ لِمَنْ لَّمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ**'' (**الصحیح للبخاری، کتاب الأذان، باب: وجوب القراءۃ للإمام والمأموم، رقم الحدیث: 756**) یعنی سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز ادا نہیں ہو سکتی، اور کوئی نماز سورۂ فاتحہ کے بغیر وجود ہی نہیں رکھتی۔ اس مبارک قول میں کتنی صداقت ہے۔ اس کے بعد یعنی ان مراحلِ تعریف اور بیان کے بعد تیری فاتحہ درست ہو جائے گی۔ اور فاتحہ یہی جو میں نے ابھی ذکر کی اور تم نے سُنی۔ اور یہ بات قطعی طور پر ناجائز اور حرام ہے کہ ہم اور تم اور تمام اہلِ ظواہر یہ لاف زنی کریں کہ ہم نماز پڑھتے ہیں اور فاتحہ پڑھتے ہیں۔ افسوس... صد افسوس! کہ ہم نے تمام عمر میں ایک نماز بھی نہیں پڑھی اور ایک دفعہ بھی فاتحہ نہیں پڑھی اور تکبیر اور نیت نہیں کہی۔ یہی جو میں نے ذکر کیا اور جس کی تشریح کی، یہی فاتحہ، نیتِ قبلہ، تکبیرِ توجہ اور قیام تھے۔ مگر اس قسم کی نماز ہمارے شیخ صاحب یعنی شیخ رحمکار صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شایانِ شان ہے۔ جس کے بارے میں شیخ محمد حسینؒ نے بطور رمزاً کنایتاً کہا تھا کہ تیس 30 سال ہوئے کہ میں قلم کو ارادتاً مقدور بھر استعمال کرتا ہوں، لیکن اس کے رموز ابھی تک مکمل نہیں ہوئے اور مکمل ہونے کے بھی نہیں۔

اور یہ چند نکات جو کہ انوار کے سمندروں میں سے اس فقیر کو جلوہ نما ہوئے ہیں، آسان

طریقہ پر حل شدہ انداز میں تحریر کرتا ہوں۔ حقیقت میں اِس کی حقیقت تک کوئی بھی نہیں پہنچ سکتا اور نہ اس تک کسی کی رسائی ہو سکے گی۔

تشریح:

حضرت کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی نماز کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔ اس سلسلہ میں ابھی مزید بات چل رہی ہے۔

اصل میں ہم ظاہر کے لحاظ سے نماز پڑھتے ہیں، ورنہ یہی نماز ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے تھے۔ یہی نماز حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پڑھتے تھے۔ یہی نماز تمام صحابہ پڑھتے تھے۔ یہی نماز انبیاء پڑھتے رہے ہیں۔ یہی نماز بزرگانِ دین پڑھتے رہے ہیں اور یہی نماز ہم بھی پڑھ رہے ہیں۔ یہی نماز ایک بچہ بھی پڑھتا ہے، جس نے ابھی ابھی نماز سیکھی ہوتی ہے۔ لیکن ان سب کی نماز برابر نہیں ہے، بلکہ ہر ایک کی نماز اس کے مقام کے لحاظ سے ہے۔ اب اگر شرعی طور پر یہ کہہ دیا جائے کہ جو شخص اس مقام کے مطابق نماز نہیں پڑھتا، جس مقام کی رسول ﷺ کی نماز تھی، تو اس کی نماز نہیں ہوتی، پھر تو اس پر عمل ہی نہیں ہو سکے گا اور اگر کم سے کم درجے والی نماز کو کامل سمجھ لیا جائے، تو درجۂ کمال تک پہنچنے کی کوشش رک جائے گی یعنی کمال تک پہنچنے کی کوشش نہیں ہو سکے گی۔ اس وجہ سے عملی صورتِ حال یہ ہے کہ جس درجہ کی نماز میسر ہے، اس نماز کو تو نہ چھوڑیں، بے شک وہ نماز اس درجۂ کمال کی نہ ہو، جس درجۂ کمال کی ہونی چاہئے۔ لیکن اسی نماز کو کافی سمجھ کر اس میں ترقی کی کوشش چھوڑنا؛ یہ بذاتِ خود ایک قسم کا اعراض اور سستی ہو گی، کیوں کہ جب آپ کسی چیز میں ترقی چاہتے ہیں، تو پہلے ترقی یافتہ صورت آپ کو سمجھ میں آنی چاہئے۔ اگر

آپ کو کسی چیز کی ترقی یافتہ صورت معلوم نہ ہو، تو آپ ترقی کیسے کریں گے؟ آپ جس سیڑھی پر کھڑے ہیں، اگر اس سے اگلی سیڑھی آپ کو نظر نہیں آرہی، تو آپ اگلی سیڑھی پر کیسے چڑھیں گے؟ اس لئے پہلے سیڑھیاں نظر آنی چاہیں، بے شک آپ ابھی ان سیڑھیوں تک پہنچے نہ ہوں۔ مگر آپ کو پتا ہونا چاہئے کہ اس منزل تک مثلاً ستر سیڑھیاں ہیں اور آپ ابھی پہلی سیڑھی پر قدم رکھے ہوئے ہیں۔ لیکن اگر آپ کو سیڑھیاں نظر نہیں آرہیں، تو آپ ان سیڑھیوں پر نہیں چڑھ سکتے۔ اس لئے اگرچہ آپ پہلی سیڑھی پر ہوں، لیکن آپ کو ستر کی ستر سیڑھیوں کی معرفت حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے تاکہ آپ ان سیڑھیوں پر چڑھ کر اس مقام کو حاصل کر سکیں۔

ابھی جو بیان ہوگا، ان شاءاللہ، اس بیان کو بھی اسی مقصد کے لئے سمجھیں، ورنہ پھر یہ ہوگا کہ انسان ڈر جائے گا اور کہے گا کہ میں تو نماز پڑھتا ہی نہیں۔ لہٰذا ہم اس کو کہیں گے کہ آپ نماز پڑھ رہے ہیں، آپ کی نماز ہو بھی رہی ہے اور ان شاءاللہ قبول بھی ہوگی، لیکن اس سے آگے بھی راستے ہیں۔ جیسا کہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا تھا کہ حضرت! آپ بھی وہی اعمال کرتے ہیں، جو اعمال ہم کرتے ہیں، لیکن آپ آپ ہیں اور ہم ہم ہیں۔ کون سی چیز ہے، جس میں فرق ہے؟ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو ایک جملے میں سمجھا دیا کہ تم جو اعمال کرتے ہو، تمہارا نفس ان کو کھا جاتا ہے۔ اس لئے جتنی نفس کی نفسانیت ختم ہوگی اور روح کی روحانیت بڑھے گی، اتنی ہماری نماز کی کیفیت بڑھ جائے گی۔ یہ بالکل ایک سرکل کی طرح ہے کہ یہ کیفیت نماز کو improve (بہتر) کرے گی۔ پھر نماز اس کیفیت کو improve (بہتر) کرے گی، پھر یہ کیفیت نماز کو improve (بہتر) کرے گی، پھر نماز اس کیفیت کو improve (بہتر) کرے

گی۔اس طریقے سے انسان ترقی کی سیڑھیوں پر چڑھتا جائے گا۔اس وجہ سے ان کتابوں کو پڑھنے کا کم از کم یہ فائدہ ہو گا کہ ہمیں جہاں تک پہنچنا ہے، اس کا راستہ ہمیں معلوم ہو جائے گا۔یہی معرفت ہے۔پھر اس کے بعد ہر ایک شخص اپنی اپنی ہمت اور استعداد کے مطابق ترقی کرے گا۔اور یہ بات بھی ہے کہ اگر ایسی استعداد والے حضرات ایسے مشائخ تک پہنچ جائیں، جو ان حضرات سے کام لے لیں اور ان کو اس مقام تک پہنچادیں، تو ان کو ان کی استعداد کا فائدہ ہو جائے گا اور اگر وہ ایسے مشائخ تک نہیں پہنچ سکے، جو ان کی استعداد کے مطابق ان سے کام لے سکیں، تو پھر ان کی استعداد ضائع بھی ہو سکتی ہے۔حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس بات کا ذکر فرمایا ہے۔اس وجہ سے ان دونوں باتوں میں انسان کو کوشش کرنی چاہئے۔انسان ایسے اچھے لوگوں تک پہنچے، جہاں اس کی استعداد استعمال ہو جائے اور اس کو معرفت حاصل ہو جائے، پھر ہمت کے مطابق اس معرفت کے مطابق عمل کرتا رہے۔

حضرت نے فرمایا کہ **''مثالیں باتوں کے ستارے ہوتی ہیں۔''** یعنی مثالوں سے باتوں میں رہنمائی حاصل ہوتی ہے، کیونکہ ستاروں سے ہدایت حاصل ہوتی ہے جیسا کہ قرآن پاک میں بھی ہے۔گویا مثالوں سے بہت بڑا مفہوم چند الفاظ میں سمٹ کے سامنے آجاتا ہے، جس سے اس مفہوم تک رسائی بہت آسان ہو جاتی ہے۔لہٰذا یہاں بھی مثالوں کے ذریعے سے چیزیں سمجھائی جائیں گی۔فرمایا:

متن:

''اَلْاَنْبِیَآءُ یُصَلُّوْنَ فِیْ قُبُوْرِھِمْ'' (میزان الاعتدال بتغییر یسیر، رقم الصفحۃ: 1/460،

مکتبہ: دارالمعرفۃ، بیروت) ''انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں نماز ادا کرتے ہیں''۔

تشریح:

یہاں نماز کے بارے میں بات ہو رہی ہے، گویا نماز کا کوئی ایسا مقام بھی ہے، جو قبر میں بھی انبیاء کرام کو حاصل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جن کو انبیاء کرام کے نقشِ قدم پر لے آئے، ان کے لئے بھی ہو سکتا ہے۔ حضرت فضلِ حق گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ مجذوب نما بزرگ تھے۔ انہوں نے کہا کہ اگر جنت میں حور آجائے، تو میں کہوں گا کہ تو بھی یہاں بیٹھ جا، نماز پڑھنی ہے تو پڑھ۔ لہٰذا نماز کے ساتھ جن کو تعلق ہوتا ہے، ان کی بات الگ ہوتی ہے۔ جیسا کہ انبیاء کرام علیہم السلام قبروں میں جا کر بھی نمازیں پڑھتے ہیں، حالانکہ وہ عمل کی جگہ نہیں ہے، وہاں جو عمل ہوتا ہے، وہ صرف شوق کی وجہ سے ہوتا ہے۔ وہاں اگر کوئی قرآن پڑھتا ہے، تو وہ قرآن کے شوق کی وجہ سے پڑھتا ہے۔ وہاں اگر کوئی نماز پڑھتا ہے، تو وہ نماز کے شوق کی وجہ سے پڑھتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں نماز ادا کرتے ہیں'' یہ صورتاً ظاہری طور پر موت ہے۔ (یعنی ظاہری طور پر تو قبر موت کی نشانی ہے) اور باطنی طور پر زندگی ہے۔ (یعنی ان کو وہ زندگی حاصل ہے، جو کبھی ختم نہیں ہوگی)۔ آگے فرمایا:

متن:

تم نے طہارت کی تشریح سُن لی، اب نیت کے اسرار سُن لو۔

تشریح:

یعنی نیت کیا چیز ہے؟ چونکہ نماز کے لئے طہارت شرط ہے، لہٰذا طہارتِ بدنی اور طہارتِ

روحانی کے بارے میں حضرت نے بڑی تفصیل کے ساتھ کلام فرمایا ہے۔ اب فرمایا کہ نیت جو کہ طہارت کے بعد کا عمل ہے، یعنی طہارت تک تو شرائط ہیں، مثلاً: کپڑوں کا پاک ہونا، جگہ کا پاک ہونا، جسم کا پاک ہونا، پھر قبلہ رخ ہونا ہے، یہ تمام شرائط ہیں۔ اس کے بعد نماز میں نیت کے ساتھ داخل ہوں گے۔ اور یہ بات کہ کون سی نماز میں داخل ہو رہے ہو، یہ نیت پر منحصر ہے۔ جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''**إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ**'' **(بخاری شریف، حدیث نمبر:1)** اور پھر نیت جس درجے کی ہو گی، اسی درجے کی نماز میں آپ داخل ہو جائیں گے۔ اور نیت منحصر ہے معرفت پر، لہذا جس کی جس درجہ کی معرفت ہو گی، اس کی نیت اس لحاظ سے اتنی اونچی ہو گی اور اسی حساب سے اس کا عمل اونچا ہو گا۔ آگے فرمایا:

متن:

اے بھائی! اہل ظواہر نہیں جانتے کہ نیت کیا چیز ہوتی ہے۔

تشریح:

واقعتاً اہلِ ظواہر نہیں جانتے۔ اہلِ ظواہر میں بھی کئی قسمیں ہیں، لیکن جو معرفت نیت کی ہے، وہ ان کو معلوم نہیں ہے کہ نیت کیا چیز ہے۔ فرمایا:

متن:

نیت کرنا بھی نماز کے لئے شرط ہے۔ نماز تب درست ہوتی ہے جب نیت صحیح اور درست ہو، جیسا کہ رسول ﷺ فرما چکے ہیں کہ ''**إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ**'' **(الصحیح للبخاری، رقم الحدیث:1)**

''اعمال کا دار و مدار نیتوں پر موقوف رہتا ہے''اور عبید اللہ تشتری صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''اَلنِّیَّۃُ نُوْرٌ''یعنی نیت نور ہے۔

تشریح:

نور ایسے ہے کہ نور میں یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہوتا ہے، اس میں آپ وہ دیکھ رہے ہوتے ہیں، وہ آپ کو نظر آرہا ہوتا ہے۔ لہٰذا نیت نورِ ہدایت بھی ہے، نورِ بصیرت بھی ہے، نورِ معرفت بھی ہے۔ آگے فرمایا:

متن:

اور نیت کے حروف میں یہ نکتہ پوشیدہ ہے: ''اَلنُّوْنُ اِشَارَۃٌ اِلَی النُّوْرِ''۔

تشریح:

یہ وہی مثال والی باتیں ہے، جیسے فرمایا کہ مثالیں باتوں کے ستارے ہوتے ہیں۔ یہ سارے اشارے ہیں۔

نور کیا ہے؟ اصل میں ہم بہت ساری چیزوں کو سمجھنے کے لئے تھوڑی سی چیزوں کو سمجھنے سے کام لیتے ہیں، یعنی پہلے ہم تھوڑی چیزوں کو سمجھ لیتے ہیں پھر ان کے ذریعے سے ہم دوسری چیزوں کو سمجھتے ہیں۔ جیسے پہلے ہم حروفِ تہجی کو سیکھ لیتے ہیں، پھر حروفِ تہجی کے ذریعے سے باقی تمام لکھائی اور پڑھائی کو سیکھتے ہیں۔ اسی طرح اصل مقصود نیت کو سمجھانا ہے، لیکن نیت کو سمجھانے کے لئے کچھ راستہ تو ہونا چاہئے۔ یہ ان حضرات کے تجربے ہیں اور ان تجربوں کے ذریعے سے انہوں نے

اشارے اخذ کئے ہیں۔ آگے فرمایا:

متن:

''**اَلنِّیَّۃُ نُوْرٌ**'' یعنی نیت نور ہے، اور نیت کے حروف میں یہ نکتہ پوشیدہ ہے: ''**اَلنُّوْنُ إِشَارَۃٌ إِلَی النُّوْرِ وَالْیَاءُ إِشَارَۃٌ إِلٰی یَدِ اللّٰہِ وَالتَّاءُ إِلٰی ھِدَایَۃِ اللّٰہِ وَقِیْلَ: اَلتَّاءُ إِشَارَۃٌ إِلٰی تَاْیِیْدِ اللّٰہِ بِالْھِدَایَۃِ فَإِنَّ النِّیَّۃَ نَسِیْمُ الرُّوْحِ فَرَوْحٌ وَّرَیْحَانٌ وَّجَنَّۃُ النَّعِیْمِ**'' ''نون اشارہ ہے نور کی جانب، اور یاء اشارہ ہے ید اللہ یعنی اللہ کے ہاتھ کی جانب، اور تاء اشارہ ہے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی جانب۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ تاء اشارہ ہے اللہ تعالیٰ کی تائید جو کہ ہدایت کی جانب ہو۔

تشریح:

یعنی پہلے آپ کو نور ملتا ہے، اس کے بعد پھر اللہ کی طرف سے تائید ہوتی ہے اور پھر اس کے بعد ہدایت ملتی ہے۔ کیونکہ اگر آپ نے صحیح راستہ دیکھ بھی لیا لیکن اگر اللہ کی تائید نہیں ہوگی تو آپ اس پہ چل نہیں سکیں گے، اور ہدایت ٹارگٹ ہے، یہاں تک پہنچنا ہے۔ اور نیت میں پوشیدہ جو نور ہے، اس کے ذریعے آپ اللہ کی تائید سے اپنے ٹارگٹ یعنی ہدایت تک پہنچتے ہیں۔

آگے فرمایا:

متن:

خوشبو اور نعمتوں سے بھرپور جنت ہے'' پس اے بھائی! اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے۔ اور

نیت کوئی چیز نہیں ہوتی، لیکن اللہ تعالیٰ کا کرم وعطا ہوتی ہے۔

تشریح:

یعنی اللہ جل شانہٗ اگر صحیح نیت نصیب فرمادیں، تو یہ بہت بڑی نعمت ہے۔ ایک بزرگ نے فرمایا کہ امت بدنیت نہیں ہے، بے نیت ہے۔ یعنی ان کے پاس نیت نہیں ہے۔ مثلاً: لوگ بہت سارے اچھے کام کرتے ہیں، لیکن نیت کوئی نہیں ہوتی۔ اگر نیت کر لیں تو ان کا ثواب پالیں۔ مثلاً: میں بہت خدمت گار ہوں، لوگوں کی خدمت کرتا ہوں، رفاعی کاموں میں شامل ہوتا ہوں، سب کچھ کرتا ہوں، لیکن اس میں میری نیت کوئی نہیں ہے۔ لہٰذا گناہ بھی کوئی نہیں ہے، ثواب بھی کوئی نہیں ہے۔ کیونکہ اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔ اس لئے پہلے اپنی نیت بناؤ کہ آپ کس لئے کام کر رہے ہیں۔ اگر میں یہ نیت بنالوں کہ مخلوق اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے اور مخلوق کی خدمت کرنے سے اللہ تعالیٰ کو بڑی خوشی ہوتی ہے، اس لئے اگر میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے مخلوق کی خدمت کروں کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے راضی ہو جائے، تو یہ نیت ہے۔ اب اگر میں یہ نیت کروں گا، تو ثواب ملے گا، اور نیت کے حساب سے ثواب ملے گا۔ اس نیت میں جس درجہ کا اخلاص ہو گا، اتنا زیادہ ثواب ملے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا کہ اگر وہ ایک مُد خیرات کر دیں، تو وہ باقی لوگوں کے احد کے پہاڑ کے برابر سونا خیرات کرنے سے افضل ہے۔ یہ نیت کی بنا پر ہی تھا کہ ان کی اتنی پاک نیت تھی۔ بلکہ یہاں تک فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مابین جو اختلاف تھا، وہ آج کے دور میں اولیاء اللہ میں اتفاق سے زیادہ مقبول تھا۔ کیونکہ ہمارے اتفاق میں کچھ غرض شامل ہوتی ہے۔ نیت پوری طرح صحیح نہیں

ہوتی۔ کچھ غرض شامل ہوتی ہے کہ فلاں خفانہ ہو جائے، یہ نہ ہو جائے، وہ نہ ہو جائے۔ لہٰذا جس میں جس درجہ آلودگی ہو گی، اس کا وہی درجہ ہو گا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اللہ کے لئے اختلاف کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم رہ نہ جائے، لہٰذا وہ اسی لئے اختلاف کرتے تھے۔ چنانچہ اللہ کے لئے اختلاف کرنا اور اپنی غرض کے لئے اتفاق کرنا؛ ان میں فرق تو ہے۔ بظاہر اتفاق میں اچھائی نظر آتی ہے اور اختلاف میں برائی نظر آتی ہے، لیکن وہ حضرات اللہ کی رضا کے لئے اختلاف کرتے تھے۔ مثلاً: اگر کسی نے مسجد کے پاس کِلّا گاڑ دیا تاکہ کوئی جانور وغیرہ باندھنا چاہیں، تو باندھ سکیں، اور دوسرے نے اسے نکال دیا کہ کہیں کسی کو ٹھوکر نہ لگے۔ ان دونوں کو اپنی اپنی نیت کا ثواب مل گیا۔ حالانکہ عمل مختلف ہے، لیکن ثواب دونوں کو اپنی اپنی نیت کا مل رہا ہے۔ پس پتا چلا کہ نیت بنیادی چیز ہے، عمل اس کے پیچھے ہے۔ عمل اس پر منحصر ہے۔ جیسے فرمایا گیا: ''**إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ**'' (بخاری شریف، حدیث نمبر:1)

ترجمہ: ''اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے''

لہٰذا ہم سے ہماری نیتوں کا حساب ہو گا۔ اس وجہ سے جس نے جس نیت کے ساتھ کوئی کام کیا، وہ نیت اس کے ساتھ رہے گی۔ مثلاً: ایک شخص اچھی نیت سے نماز پڑھاتا ہے اور دوسرا آدمی نماز نہیں پڑھاتا اور وہ بھی اچھی نیت سے نہیں پڑھا رہا، ان دونوں کو اجر مل رہا ہے۔ ایک کو نماز پڑھانے پہ زیادہ اجر مل رہا ہے اور دوسرے کو نہ پڑھانے پہ زیادہ اجر مل رہا ہے۔ ایک آدمی خدمت کر رہا ہے اچھی نیت سے، دوسرا آدمی خدمت لے رہا ہے اچھی نیت سے، دونوں کو اجر مل رہا ہے۔ ایک دفعہ

ایسا ہوا کہ حضرت مولانا یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بہت چکر لگانے لگے، بہت زیادہ مشی کرتے تھے۔ لوگوں نے پوچھا: کیا بات ہے؟ آج کل تو آپ نظر ہی نہیں آتے، ہر وقت مشی کرتے رہتے ہیں۔ آخر کوئی حد بھی ہوتی ہے؟ حضرت بڑے مجذوب تھے، اللہ والے تھے۔ فرمایا: مجھ سے فرمایا گیا ہے کہ جہاں جہاں تیرے قدم جائیں گے، وہاں تک آبادی کروں گا اور وہ جگہ آباد ہو جائے گی۔ اس لئے اب میں روزانہ زیادہ سے زیادہ چلتا ہوں، تاکہ یہ جگہ آباد ہو جائے۔ یہ بظاہر تو سیر ہے، وہ ویسے ہی سیر نہیں تھی، بلکہ وہ سیر الی اللہ تھی۔ یہ بات عام لوگ نہیں جانتے، لہذا لوگ اعتراض بھی کر دیتے ہیں۔ کمال کی بات ہے کہ معترض اعتراض کرتا ہے کہ شاید یہ اس سے خراب ہو رہا ہے، حالانکہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کو دے رہا ہوتا ہے۔ ایک دفعہ مجھے کسی نے کہا کہ مولانا اشرف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے گھر پر ٹیلی ویژن کا انٹینا ہے۔ بیعت کے بعد میں نے خود مولانا صاحب سے پوچھا تھا کہ حضرت! ٹیلی ویژن کے بارے میں آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں؟ فرمایا: میں تو نہیں دیکھتا۔ مجھے پیغام کا پتا چل گیا کہ حضرت نہیں دیکھتے، اس لئے مجھے نہیں دیکھنا چاہئے۔ لہذا مجھے تو پتا تھا۔ بہر حال! اس نے یہ بات کہی۔ بعد میں جب میں نے تحقیق کی، تو پتا چلا کہ مولانا صاحب کی ایک بھانجی تھی، جس کا ذہنی توازن درست نہیں تھا اور اس کی والدہ بیوہ تھی یعنی وہ لڑکی یتیم تھی اور مولانا صاحب کے پاس ٹھہری ہوئی تھی۔ اس کی بیوہ ماں نے اپنی بچی کو باہر سے بچانے کے لئے ٹیلی ویژن اپنے کمرے میں لگایا تھا، کیونکہ وہ مرفوع القلم تھی، کیونکہ پاگل مرفوع القلم ہوتا ہے۔ اس پر شریعت کا حکم لاگو نہیں ہوتا۔ مولانا صاحب نے اس کو برداشت کیا تھا۔ میں نے سوچا کہ کمال کی بات ہے کہ مولانا صاحب کو اس پر کتنی تکلیف ہو رہی ہو گی اور اس پر اللہ پاک

حضرت کو کتنا اجر دے رہے ہوں گے۔ اور لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ کام غلط ہے اور ان پہ اعتراض کرتے ہیں۔

اسی طرح تسنیم الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں کچھ لوگوں نے کہا کہ حضرت ٹیلی ویژن دیکھتے ہیں۔ میرا حضرت کے ساتھ چونکہ بہت قریبی تعلق تھا، مجھے ہر قسم کے سوال کرنے کی اجازت تھی۔ میں نے حضرت سے عرض کیا کہ حضرت! آپ کے بارے میں میں نے یہ سنا ہے، چونکہ مجھے جواب دینا ہوتا ہے، لہذا آپ سے اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ یہ کیا بات ہے؟ حضرت مسکرائے اور فرمایا: یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ کہیں میں مہمان ہو چکا ہوں (چونکہ حضرت مفلوج تھے) اور اگر مجھے کسی ایسے کمرے میں ٹھہرایا گیا، جہاں پہ ٹیلی ویژن ہو، جس کی وجہ سے کسی نے کہا ہو، تو ٹھیک ہے، وہ کہہ سکتا ہے۔ لیکن خود میرے گھر میں تو نہیں ہے اور نہ میں دیکھتا ہوں۔ بلکہ تیری پھوپھی نے بارہا کہا ہے کہ بچیاں ٹیلی ویژن کے لئے کیوں ادھر ادھر جائیں؟ ان کے لئے ٹیلی ویژن رکھ لیتے ہیں۔ میں نے اتنا کہا کہ میں معذور آدمی ہوں اور تو کچھ نہیں کر سکتا، ہاں اس کا شیشہ اپنے ہاتھ سے توڑ سکتا ہوں لہٰذا تو لاتی رہ اور میں شیشہ توڑتا رہوں گا۔ اب دیکھیں! حضرت کا معاملہ کیا تھا اور لوگوں کا خیال کیا تھا۔ ایک دفعہ ایک بزرگ دریا کے کنارے کہیں جا رہے تھے۔ دیکھا کہ ایک عورت لیٹی ہوئی ہے اور اس کے اوپر ایک صاحب نے اس کے منہ میں کوئی بوتل وغیرہ دی ہوئی ہے۔ انہوں نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا، صرف ان کے دل میں خیال آیا کہ بے حیائی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ اس طرح کھلی بے حیائی ہو رہی ہے۔ اسی دوران ایک دم شور مچ گیا۔ دیکھا کہ دریا میں ایک کشتی الٹ گئی ہے، تو وہ آدمی اس عورت کو چھوڑ کر بھاگا اور دریا میں چھلانگ لگا دی۔ اور

دریامیں گیارہ بارہ ڈوبنے والوں کو بچالیااور پھر واپس آکران کی طرف منہ کرکے کہا: یہ میری والدہ ہے، یہ بیمار ہے، میں اس کو دوائی پلارہا تھااور میرے بارے میں تونے یہ گمان کیا۔ میں نے الحمدللہ گیارہ لوگوں کوڈوبنے سے بچالیاہے، تونے کیا کیا؟ گویافوراًان کوتبنیہ ہوگئی کہ میں کیاسوچ رہا تھااور اصل حقیقت کیاہے۔ لہٰذانیت بہت بڑی چیز ہوتی ہے۔ انسان اگراپنی نیت صحیح کرلے تو بہت سارے مسائل حل ہوجائیں۔

مجھے حضرت نے کوئی مخصوص مراقبہ نہیں بتایا تھا۔ جب کبھی کوئی اس قسم کاخیال آتا، تومیں حضرت کے ساتھ شئر کرلیتاکہ حضرت اب تومجھے یہ سوچ آرہی ہے، یہ ہورہاہے۔ فرمایا: ہاں یہ فلاں مراقبہ ہے، اب اس کونیت کرکے کریں تاکہ ثواب ملے۔ اس کامطلب یہ ہواکہ اگرخودبخود کچھ ہورہاہو تواس وقت تک اس کاثواب نہیں مل رہا، جب تک کہ آپ نے اس کی نیت نہیں کی۔ گویانیت اتنی ضروری ہے۔ کیونکہ نیت کے بغیر عمل نہیں ہے۔ بےنیتی کے ساتھ عمل نہیں ہوتا۔ لہٰذااپنی نیتوں کودرست کرناچاہئے۔ نیتوں کودرست کرنادنیاکا بہت بڑامفید کام ہے۔ بہت عقل مندی کاکام ہے۔ بغیر نیتوں کودرست کئے انسان کے اعمال درست نہیں ہوسکتے۔ آگے فرمایا:

متن:

اوراللہ تعالیٰ کی جانب سے خلعت ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ بشر حافی رحمۃاللہ علیہ نے جناب حسن بصری رحمۃاللہ علیہ کی میت پر نماز جنازہ نہیں پڑھی، دوستوں نے اس پر اعتراض کیاکہ تم نے حسن بصری رحمۃاللہ علیہ پر نمازہ جنازہ نہیں پڑھی۔ بشر حافی رحمۃاللہ علیہ نے جواب میں فرمایاکہ ''**لَا أَجِدُ نِيَّةً**''، ''مجھے نیت حاصل نہیں تھی''۔ انہوں نے کہاکہ سب دوست مذکورہ نیت سے

محروم تھے۔ پس نماز میں اس قسم کی نیت درکار ہوتی ہے تاکہ نماز ادا کی جاسکے۔ نیت کے بعد تکبیر کہنا ہے تاکہ نماز میں جو باطل سامنے ہو سب کو آگ میں جلاڈالے اور نماز میں باطل کا شائبہ تک نہ رہے۔

تشریح:

تکبیر کا مطلب کیا ہے؟ لفظِ تکبیر ہم بہت کہتے ہیں اور ''**اَللّٰہُ اَکْبَرُ**'' بھی بہت کہتے ہیں، لیکن ''**اَللّٰہُ اَکْبَرُ**'' کا تعلق دل کے ساتھ ہے۔ ''**اَکْبَرُ**'' یعنی میں کسی کو بڑا سمجھتا ہوں، تو کتنا بڑا سمجھتا ہوں؟ یہ چیز میرے دل کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ ظاہر ہے کہ میں ہر چیز کو بڑا کہہ سکتا ہوں۔ جیسے یہ بڑی بوتل ہے، یہ بڑی فریج ہے، یہ بڑا فلاں ہے، یہ بڑا فلاں ہے۔ گویا میرے ذہن کے اندر ایک تصور ہوتا ہے کہ وہ کتنی بڑی چیز ہے۔ جب ہم ''**اَللّٰہُ اَکْبَرُ**'' کہتے ہیں کہ اللہ سب سے بڑے ہیں، تو میرے خیال میں جو چیزیں میرے لئے اہم ہیں اور وہ اللہ کی اس بڑائی میں حائل ہیں، تو گویا میں اللہ پاک کو اتنا بڑا نہیں سمجھ رہا جیسا ہونا چاہئے۔ جس چیز کی طرف دیکھ رہا ہوں، تو گویا میں اس کو اللہ تعالیٰ سے زیادہ توجہ دے رہا ہوں۔ تو یہ کتنی خطرناک بات ہے۔ بارہا ایسا ہوا کہ اگر نیت میں کسی بزرگ کا، کسی ولی کا، کسی بڑے کا خیال آیا، تو اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ فوراً میرے دل میں یہ تقاضا پیدا ہوتا ہے کہ نماز میں نہیں، نماز میں تو صرف اللہ ہی ہے۔ نماز میں اور کوئی نہیں ہے۔ نماز کے اندر ہم جو تکبیر کہتے ہیں: ''**اَللّٰہُ اَکْبَرُ**'' اس ''**اَللّٰہُ اَکْبَرُ**'' کے ساتھ گویا ہم ہر غیر کو پیچھے کر دیتے ہیں۔ ''**اَللّٰہُ اَکْبَرُ**'' کے ساتھ رفع الیدین یعنی اپنی ہتھیلیوں کو کعبہ کی طرف کر کے گویا ہم تمام چیزوں کو پیچھے کر دیتے ہیں۔ جیسے ہم

کسی کو ہاتھ سے اشارہ کر کے کہتے ہیں کہ دفع ہو جا۔ گویا ہم دونوں ہاتھوں سے دفع کرتے ہیں اور سامنے کی طرف نہیں کرتے، بلکہ پیچھے کی طرف کرتے ہیں کہ باقی ساری چیزیں اب میرے سامنے نہیں ہیں۔ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ، اب میرے سامنے کچھ بھی نہ آئے۔ کیونکہ میں اب اللہ پاک کے دربار میں داخل ہو رہا ہوں۔ جب اللہ کے دربار میں داخل ہوں، تو وہاں اللہ کے سوا میرے سامنے اور کوئی نہیں آنا چاہئے، ورنہ پھر اتنا ہی میں اللہ تعالیٰ کے وصال سے محروم ہو جاؤں گا۔ اور یہ ہر شخص کی اپنی اپنی معرفت ہے۔ جس کی جتنی معرفت ہے، اس کی تکبیر میں اتنا وزن ہو گا، اتنا زور ہو گا، اتنا ہی وہ غیر اللہ کو دفع کر سکے گا۔ نتیجتاً اتنا اللہ جل شانہٗ کا قرب حاصل کر سکے گا۔

آگے فرمایا:

متن:

تاکہ نماز میں جو باطل سامنے ہو سب کو آگ میں جلا ڈالے (یعنی دفعہ کرے) اور نماز میں باطل کا شائبہ تک نہ رہے اور سب حق ہی حق رہ جائے۔ (''**اَلْحَقُّ لِلْحَقِّ**'' سب حق ہی حق رہ جائے) ﴿**قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ...**﴾ (بنی اسرائیل:81)

تشریح:

اس واقعے کو ذرا دل میں لے کر آئیں کہ یہ آیت کہاں پڑھی گئی تھی؟ اس کا شانِ نزول کیا تھا؟ چنانچہ جب آپ ﷺ خانہ کعبہ سے بت گرا رہے تھے اور ساتھ ساتھ ﴿**قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا**﴾ (بنی اسرائیل:81) پڑھ رہے تھے۔ وہ تو خانہ کعبہ تھا۔ اسی

طرح ہمارے دل کے اندر جتنے بت ہیں، وہ سارے کے سارے گرادو۔ سارے کے سارے دفع کر دو اور یقین جانئے کہ ہر چیز کی قرآن پاک میں دلیل موجود ہے۔ ذرا سمجھنے کی بات ہے۔ اللہ پاک فرماتے ہیں:

﴿اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ﴾ (الجاثیہ:23)

ترجمہ: ''پھر کیا تم نے اسے بھی دیکھا جس نے اپنا خدا اپنی نفسانی خواہش کو بنالیا ہے''۔

اصل میں ہماری ہر خواہشِ نفس بت ہے۔ ان بتوں نے ہمارے تعلق کو خراب کیا ہے۔ البتہ یہ باطنی بت ہے، ظاہری بت نہیں ہے۔ جلی نہیں ہے، خفی ہے۔ اگر جلی ہو تو پھر تو انسان کافر اور مشرک ہو جاتا ہے۔ یہ خفی ہے، اسی لئے ریا خفی شرک ہے۔ ریا کی وجہ سے انسان اس طرح مشرک نہیں ہوتا، جس طرح بتوں کو ماننے سے مشرک ہوتا ہے اور ماسوی اللہ خداؤں کو ماننے سے مشرک ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ اللہ تعالیٰ سے تعلق میں رکاوٹ ڈالتے ہیں، اللہ تعالیٰ تک پہنچنے میں حائل ہیں۔ لہذا یہ بھی بُت ہیں۔ جس کا جتنا بڑا بت ہوتا ہے، وہ اسی کے حساب سے اللہ تعالیٰ سے دور ہوتا ہے۔ جنہوں نے خواہشاتِ نفس کو اپنا معبود بنایا ہوتا ہے، وہ اپنی خواہشاتِ نفس کی وجہ سے مار کھا رہے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دور ہو رہے ہوتے ہیں۔ یہاں فرمایا: ﴿قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا﴾ (بنی اسرائیل:81) یعنی اس آیت کے مطابق اپنے دل سے تمام باطل چیزوں کو ہٹادو۔ آگے فرمایا:

متن:

اے بھائی! پروانہ جو آگ کا عاشق ہے، جب وہ اپنے آپ کو آگ کے حوالے کرتا ہے اور آگ

اس کو قبول کرتی ہے اور وہ پروانہ غیر کی نفی کرتا ہے تو اس کو آگ ہی سے قوت حاصل ہوتی ہے، اور کسی غیر کے بغیر اُس کو اُس سے قوت حاصل ہوتی ہے۔ اے بھائی! میں نہیں جانتا کہ کیا لکھوں۔ یہ ایسا مقام ہے جہاں زمان و مکان اُٹھ جاتے ہیں۔ پس محمد حسینؒ کے اِن اشعار پر غور کرنا چاہئے۔

تشریح:

واقعتاً اگر انسان غور کرے، تو زمان و مکان کا تعلق انسان کے ساتھ موجود ہے اور اس دنیا کے ساتھ ہے۔ ایک دفعہ کسی کو بادشاہِ وقت نے کہا تھا کہ میری سلطنت سے اتنی دیر میں نکل جاؤ۔ اس وقت سلطنت کی سرحدیں کافی دور دور تک ہوتی تھیں، اور وقت کم تھا۔ اس سے پتا چلا کہ اس کو مارنے کا ارادہ ہے، یعنی اگر تو اتنی دیر تک نہیں نکلا، تو میں تجھے قتل کر دوں گا۔ اس نے وہاں اس وقت کے ایک بزرگ سے مشورہ کیا کہ میں کیا کروں؟ کیونکہ مجھے یہ کہا گیا ہے۔ اس بزرگ نے فرمایا کہ جا کر مسجد میں بیٹھ جاؤ۔ اگر وہ مسجد میں مارنے کے لئے آجائیں، تو ان کو کہہ دو کہ مسجد خدا کا گھر ہے، یہاں تمہاری نہیں چلتی۔ میں تمہاری سلطنت میں نہیں ہوں۔ مسجد میں تمہاری حکومت نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے وہی کیا۔ وہ چونکہ سمجھ دار لوگ تھے، تو انہوں نے مان لیا کہ واقعی مسجد میں تو ہماری حکومت نہیں ہے۔ بہر حال! انسان کو زمان و مکان کے ساتھ تعلق حاصل ہے۔ جب اللہ کی بات آگئی، تو پھر ساری چیزیں ہٹ گئیں۔ لہٰذا انسان اگر اللہ کے ساتھ ہو، تو وہ تمام چیزوں کو بھول جائے گا۔ زمان کو بھی بھول جائے گا، مکان کو بھی بھول جائے گا۔ جتنے اس کو زمان و مکان یاد ہیں، اتنا ہی وہ محروم ہے۔ لہٰذا اس کو زمان و مکان کو چھوڑ دینا چاہئے۔ بس اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کرنا چاہئے، لیکن یہ ساری باتیں وحدۃ الوجود کی ہیں۔ یہاں تک معاملہ راستے کا ہے کہ راستہ

یہی ہے، لیکن اس کے بعد جب اس کو اللہ جل شانہٗ دوبارہ واپس لوٹائے گا اور وحدۃ الشہود کی کیفیت میں پہنچائے گا، تو پھر وہ مخلوق سے نکل کر اللہ کا ہو کر پھر مخلوق کے مطابق جو اللہ پاک کا حکم ہو گا، اس پر عمل کرے گا۔ پھر اس کو یہ پتا ہو گا کہ باقی لوگوں کے حقوق کہیں میری نماز کی وجہ سے متاثر تو نہیں ہو رہے۔ مثلاً: آپ ﷺ کی نماز ایسی تھی کہ پیچھے نماز پڑھنے والی عورتوں کے بچوں کے رونے کی آواز سن کر آپ ﷺ نماز مختصر فرما دیتے۔ گویا اس وقت آپ ﷺ کو سب یاد تھا، لیکن چونکہ آپ ﷺ اللہ کے پاس تھے، اس لئے آپ ﷺ اللہ ہی کے لئے کر رہے تھے۔ اپنے لئے نہیں ہوتا تھا۔

صحیح بات یہ ہے کہ اس وقت جو بظاہر انتہائی جذب کی حالت میں قرآن پڑھ رہے ہیں، ان میں بھی بہت کم لوگ ہیں، جو اللہ کے لئے پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ جس میں وہ مخلوق کو بھول جاتے ہیں کہ وہ دھوپ میں تپ رہے ہیں یا ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے، ان کو اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ یہ اللہ کے لئے نہیں کر رہے ہوتے بلکہ اپنی مشہوری کے لئے کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ بالکل وہی بات ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اختلاف آج کل کے اولیاء کرام کے اتفاق سے افضل تھا۔ اسی طرح آج کل کے دور کا انہماک فی الصلوٰۃ کا حال ہے۔ کیونکہ یہ اپنے نفس کے لئے ہے۔ اور آپ ﷺ کا اس وقت ان تمام چیزوں میں لوگوں کا خیال رکھنا افضل ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ'' (بخاری شریف، حدیث نمبر:605)

ترجمہ: ''نماز اس طرح پڑھو، جس طرح تم مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو''۔

آپ ﷺ نے نماز کیسے پڑھی اور کیسے پڑھائی؟ اس میں اگر غور کریں، تو معلوم ہوتا ہے کہ

آپ ﷺ کی اپنی انفرادی نماز بڑی لمبی ہوتی تھی اور اجتماعی نماز یعنی جماعت کی نماز مختصر ہوتی تھی۔اور آج کل صورتحال یہ ہے کہ جماعت کی نماز لمبی اور اپنی انفرادی نماز مختصر ہوتی ہے۔ایک دفعہ ہماری مسجد کے امام صاحب بڑی لمبی نماز پڑھاتے تھے۔ سترہ اٹھارہ منٹ میں چار رکعت پڑھاتے تھے۔ میں نے ان کی چار رکعت سنتوں کو باقاعدہ نوٹ کیا کہ وہ کتنی دیر میں پڑھتے ہیں، تو وہی چھ سات منٹ لگاتے تھے۔ وہی اُلٹی بات کہ اپنی انفرادی نماز کم وقت میں اور جماعت کی نماز لمبی پڑھتے تھے۔ بظاہر تو یہ بات لوگوں کی نظر میں اچھی ہے کہ واہ جی واہ، حالانکہ واہ جی سے بات نہیں بنے گی۔ یہ بات دیکھی جائے گی کہ سنت کے مطابق کون سا عمل ہے۔ سنت کے مطابق تو اپنی انفرادی نماز لمبی ہونی چاہئے، کیونکہ آپ ﷺ کی انفرادی نماز اتنی لمبی ہوتی تھی کہ رات کی نماز میں پاؤں میں ورم آجاتا تھا اور اجتماعی نماز ایسی ہوتی کہ بچوں کے شور سے اس کو مختصر فرمادیتے تھے۔آگے حضرت نے فرمایا کہ محمد حسینؒ کے ان اشعار میں غور کرلو۔ وہ اشعار تو میں نے پڑھ دیئے ہیں۔

اب ان کا ترجمہ دوبارہ پڑھ دیتا ہوں۔

متن:

اُس ایک نظر کے نور اور روشنی سے میرا سارا وجود سراسر محو ہو جاتا ہے۔

تشریح:

یعنی جب میں نیت کر لیتا ہوں، تو اس کے بعد میرا سارا وجود سراسر محو ہو جاتا ہے۔ میں ''اَللّٰہُ اَکْبَرْ'' کہہ کر اپنے آپ کو ختم کر دیتا ہوں۔ میں اب کہیں نہیں ہوتا۔

متن:

بادشاہ کے دبدبے کی شعاعِ آفتاب کی وجہ سے میں اس وقت راہ پر سے اُٹھ جاتا ہوں۔ جب میرے وجود کا نام تک نہیں رہ جاتا، تو میں آپ کی خدمت میں سجدہ ریز کیسے ہوا؟

تشریح:

اس کو ''فناء الفنا'' کہتے ہیں۔ یعنی فنا کی جو اپنی کیفیت ہے، وہ بھی فانی ہو گئی۔ یعنی جب میں نے سجدہ کرنا تھا، تو میں رہا ہی نہیں تو میں نے سجدہ کیسے کیا؟

متن:

اگر تُو اس وقت مجھے دیکھتا ہے، تو میں نہیں ہوتا بلکہ وہ جہان کا بادشاہ موجود ہوتا ہے۔

تشریح:

حضرت مولانا اشرف صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ کمال ہے، کبھی کسی کو اس طرح دیکھا ہے کہ آپ کے ساتھ بیٹھا ہو اور اچانک کہہ دے: السلام علیکم۔ اگر کوئی یوں کہہ دے تو آپ کیا کہیں گے: خیریت تو ہے!، کیوں السلام علیکم کہہ دیا؟ آپ تو ادھر ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن نماز میں ہمیشہ اسی طرح ہوتا ہے کہ انسان آپ کے ساتھ نماز پڑھ رہا ہے اور کہتا ہے: السلام علیکم۔ کوئی اس پر حیرت نہیں کرتا۔ حالانکہ سوچنا چاہئے کہ کیوں سلام کر رہا ہے۔ اصل میں وہ یہاں تھا ہی نہیں۔ ابھی ہی نماز سے باہر آیا، وہ اللہ کے پاس تھا۔ ''**اَللّٰہُ اَکْبَرُ**'' کے ساتھ اللہ کے پاس چلا گیا تھا۔

میں کہتا ہوں کہ طے ارض کو لوگ بڑا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ طے ارض اس کے مقابلہ میں بہت

کم ہے۔ کیونکہ آپ زمین میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جائیں، تو کیا ہو گیا؟ جنات بھی پہنچ جاتے ہیں۔ کیا آپ جن بن گئے؟ شریر جن بھی پہنچ جاتے ہیں۔ لہٰذا اس سے کیا ہو گیا کہ آپ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ گئے۔ اصل تو یہ ہے کہ آنِ واحد میں آپ یہاں ہوں اور یہاں نہ ہوں۔ جیسے آپ نے ''اَللّٰہُ اَکْبَرُ'' کہہ دیا تو بس آپ ادھر نہ ہوں۔ اب آپ کا رابطہ ادھر سے منقطع ہو گیا اور جس وقت واپس آ رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں: السلام علیکم ورحمۃ اللہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ اس وقت آپ دوبارہ واپس آ جائیں۔ آگے فرمایا:

متن:

میں نے پوچھا کہ اب میں نہیں جانتا کہ میں کون ہوں۔ میں بندہ نہیں ہوں، تو پھر کیا ہوں؟ میں یہ نہیں جانتا کہ تُو، میں ہے یا کہ میں ''تم'' ہوں۔ میں تمہاری ذات میں محو ہو گیا اور دوئی درمیان سے مٹ گئی''۔

تشریح:

یہ اصل میں وحدۃ الوجود کی بات ہے۔

متن:

سمجھنے والے ان باتوں کو سمجھ پاتے ہیں۔ اے میرے محبوب! بس جس چیز کی جانب روح مائل ہو کر اس جانب کا رُخ کرے، وہی اس کا قبلہ ہوتا ہے۔

تشریح:

میرا دل اگر کسی اور چیز کی طرف جا رہا ہے، تو قبلہ وہ ہو گیا۔ لیکن اگر میرا دل اللہ کی طرف

جائے، تو اللہ تعالیٰ تو ہر جگہ ہے۔

متن:

﴿فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللهِ﴾ (البقرہ:115) ''سو جس طرف تو منہ کرو، وہاں ہی متوجہ ہے اللہ''۔ (شیخ الہند)

حاصل کلام یہ کہ جب بندہ اس مقام تک پہنچ جائے، جس تک کہ ہم آواز دیتے ہیں تو وہاں نہ دِن ہوتا ہے، نہ رات ہوتی ہے۔ ''لَيْسَ عِنْدَ اللهِ صَبَاحٌ وَّلَا مَسَاءٌ'' ''اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہ صبح ہوتی ہے، نہ شام''۔ تو پھر پانچ وقتوں کو کیسے دریافت کرے گا۔ مگر جب یہ آیت ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلٰوتِهِمْ دَآئِمُوْنَ﴾ (المعارج:23) ''اور وہ لوگ جو اپنی نماز پر قائم ہیں''۔ اس گروہ کے بارے میں درست ہو۔ اس مقام پر شیخ محمد حسینؒ نے لکھا ہے کہ میں کیا کروں کہ دنیا کے حال سے بے خبر راستے کے بچوں کی طرح ہوں، اس کا بیان اور تشریح نہیں کر سکتا، لیکن تکبیر اس طرح کہنی چاہئے کہ تُو دونوں جہانوں کو محو سمجھے اور ﴿إِنِّيْ ذَاهِبٌ إِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ﴾ (الصافات:99) ''میں جاتا ہوں اپنے رب کی طرف وہ مجھے راہ دے گا''۔ کے استقبال میں چلے اور مشاہدہ کرے۔

تشریح:

یعنی انسان کا تعلق اللہ کے ساتھ ہو اور اللہ تعالیٰ سے امید ہو۔ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ ہو اور اپنی نیت کر لیں کہ اب میں نماز کے اندر داخل ہو رہا ہوں، اللہ تعالیٰ مجھے وہاں پہنچا دے گا، جہاں مجھے

پہنچنا ہے اللہ کے بھروسہ پر۔ میرا جتنا بھروسہ کامل ہوگا، جتنی نیت کامل ہوگی، اس کے حساب سے اللہ تعالیٰ اس مقام تک پہنچادے گا۔

متن:

کہ جس وقت ﴿إِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ﴾ (الانعام:79) کہے تو محبوب کے رخِ زیبا کو اپنا مرکز سمجھے۔

تشریح:

﴿إِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ...﴾ یہ واقعتاً قرآن کریم کے اندر بہت محبت والا کلام ہے۔ جیسے صحابہ کرام کے بارے میں ہے: ﴿يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ﴾ (الکہف:28) کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا چاہتے ہیں۔ یہاں ''يُرِيْدُوْنَ رِضَى اللهِ'' بھی ہوسکتا تھا، لیکن فرمایا گیا: ﴿يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ﴾ یعنی اب اللہ کی توجہ چاہتے ہیں، کیونکہ جس کا رخ کسی کی طرف ہو، تو وہ اسی کی طرف متوجہ ہے۔

متن:

اور اس کو مرکز السمٰوٰت والارض تصور کرے اور اس مقام کو دیکھے کہ ﴿فَلَآ أُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ﴾ (الحاقۃ:38-39) ''سو قسم کھاتا ہوں اُن چیزوں کی جو دیکھتے ہو اور چیزیں کہ تم نہیں دیکھتے'' اور وہ مرکز دیکھے جو ''حَنِيْفًا'' ''مِلَّةَ إِبْرَاهِيْمَ'' کا مرکز ہے، اور ''مُسْلِمًا'' کہہ کر استغفار کہے۔ اس کے بعد ﴿إِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ

رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ﴾(الانعام:62)

تشریح:

سب نیتیں اس میں شامل ہیں۔

متن:

کہ ''میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے، جو پالنے والا سارے جہان کا ہے''۔ اور ان سب کو تو ظاہر اور عیاں دیکھے اور غیر کو شوق کی آگ سے جلتا ہوا کرے۔ اس کے بعد اے بھائی! ﴿وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾(الانعام:163) ''مجھے اس کا حکم دیا گیا ہے اور میں پہلا مسلمان ہوں'' کی مبارک آیت تم کو مسلمانی سکھائے۔ اس کے بعد ﴿أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ﴾ کہنا اس مقام پر درست ہوگا۔

میرے خیال میں اس مقام کے لحاظ سے یہ کافی ہے۔ اور یہ بڑا مبارک مقام ہے۔ ان شاء اللہ اگلے بیان میں نماز کا باقی طریقہ بھی اس عنوان کے ساتھ سمجھا دیا جائے گا۔

اللہ جل شانہٗ ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمادے۔

وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُO

توضیح المعارف، قسط نمبر: 9

فلسفۂ سائنس اور معرفتِ الٰہی—چوتھا حصہ

وجودِ مُنبَسِط:

اللہ کا وہ نور جس سے ساری کائنات روشن ہے، جو ﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (النور:35) سے مستنبط ہے، اصطلاحاً اس کا نام ''وجودِ منبسط'' رکھا گیا ہے۔ اس کا نام وجود تو اس لئے ہے کہ سارے ظلال کا قیوم یہی ہے اور منبسط اس لئے ہے کہ یہ ہر چیز یعنی ظل کا قیوم ہے۔

وجود منبسط اور ظلال کے تعلق یعنی قیومیت کی حقیقت:

وجود منبسط کی ظلال کے ساتھ اس منفرد تعلق کے بارے میں بس اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ وجودِ منبسط ظلال کا قیوم ہے، کیونکہ سارے ظلال اس کے وجود کے ساتھ قائم ہیں۔ ظلال سے وجود منبسط کی نسبت ایسی نہیں جیسی نسبت ہیولیٰ کی صورت کے ساتھ ہے۔ کیونکہ وجود منبسط خالص نور اور ظہور ہے۔ جیسا ہیولی (unformed body) صورت (shape, face) کا محتاج ہے وجود منبسط اپنی تحصیل و تعیین میں ظلال کا محتاج نہیں ہے

ظلال اپنے آثار میں آپس میں مختلف ہیں اور ان کے احکام بھی جدا جدا ہیں، کیونکہ ہر ظل کی حقیقت جدا ہوتی ہے، اس لئے ان کے آثار بھی مختلف ہو جاتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے ان ظلال اور ان کے قیوم کی حیثیت ہیولیٰ یا مادے اور صورت کی طرح ہو جاتی ہے یعنی محض تشبیہ کے طور پر، نہ کہ فی الحقیقت۔ عام لوگوں کی نظر پہلے صورت پر جاتی ہے، پھر جس سے صورت کا وجود بنتا ہے اس

پر جاتی ہے۔ مثال کے طور پر انسان کو جب کوئی دیکھتا ہے، تو کوئی بھی اس کو مٹی نہیں سمجھتا، لیکن جب وہ انسان کی حقیقت پر غور کرے گا، تو اس نتیجہ تک پہنچ جائے گا، یا کمپیوٹر کی سکرین پر عام آدمی کی نگاہ پہلے پڑتی ہے، لیکن محقق مہندس (Engineer) جب سکرین کو دیکھتا ہے، تو اس کی نظر 0 اور 1 پر جاتی ہے کہ یہ سب کچھ اسی کا کرشمہ ہے۔ پس حقیقت میں قیوم کو اوّلیت حاصل ہے، لیکن بادیُ النظر میں ظلال کی طرف توجہ ہوتی ہے، اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ظلال صورت کے مشابہ اور قیوم مادے کا مشابہ ہے۔

ایک باریک نکتہ: اس صورت وہیولیٰ کی تشبیہ کو جب حقیقت کے آئینے میں دیکھا جاتا ہے، تو بندے کا ذہن تنزیہ کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے اور حقائق کھلتے جاتے ہیں۔

ایک قیوم میں کثرتوں کا ظہور:

مختلف ظلال کا جب ایک قیوم کے ساتھ رشتہ جڑتا ہے، تو ان کے مختلف آثار واحکام وجود میں آتے ہیں اور مختلف ہویتوں کا ظہور ہوتا ہے۔ ایسا نہ تو تنہا قیوم اور نہ تنہا ظلال کی وجہ سے ہوتا ہے، بلکہ ایسا صرف اس وقت ہوتا ہے، جب مختلف ظلال کا اسی ایک قیوم کے ساتھ تعلق ہوتا ہے، جس کے بعد مختلف اشیاء وجود میں آتی ہیں۔ یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جو سائنسدانوں کی دسترس میں نہیں آتا۔

کثرت میں وحدت کے ظہور کی مادی مثالیں:

کائنات میں بہت زیادہ تنوع کی وجہ سے ایمان سے بے بہرہ سائنسدان جتنی بھی تحقیق کریں، ان کو نامکمل معرفت حاصل ہوتی ہے اور وہ اس واحد قیوم تک نہیں پہنچ پاتے۔ حالانکہ ایک عام

انسان کو بھی اس کی نظیریں مل سکتی ہیں۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ سورج کی روشنی جب فضا میں آنکھوں کو نظر نہ آنے والے بارش کے قطروں پر پڑتی ہے، تو اس سے رنگ برنگی قوس قزح نمودار ہو جاتی ہے اور یہی سورج کی روشنی جب مختلف پودوں پر پڑتی ہے، تو اس سے مختلف پھل اور پھول ظاہر ہوتے ہیں۔ ایک مثال بجلی کی بھی ہے کہ بجلی سے چلنے والے مختلف آلات، میں جب بجلی کی لہر دوڑے تو وہ سب اپنا اپنا کام شروع کر دیتے ہیں، حالانکہ سب کا کام ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔

اسی طرح کمپیوٹر کے تمام functions کی اصل 0 اور 1 پر مبنی ہے۔ اس پر غور کر کے وجود منبسط کی صفات قیومیت وغیرہ کو اچھی طرح visualize کیا جا سکتا ہے۔

اس تمہید کے بعد یہ چیز سمجھنا چاہئے کہ دنیا میں ہر پیدا ہوئی چیز ایک ترکیبی جوڑے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک تو وہ ہے جو اپنے وجود میں مستقل ہے، لیکن مستور ہے۔ وہ یہی قیوم ہے اور دوسرا وہ ہے جو ظاہر و نمایاں ہے، لیکن قیوم کی وجہ سے قائم ہے۔ وہ ظل ہے۔ ظل جب قیوم کے ساتھ ملتا ہے، تو بے شمار ابتدائی ہویتیں وجود میں آتی ہیں۔ ان میں کچھ صورِ الٰہیہ ہوتی ہیں، ان کو تجلیات بھی کہتے ہیں اور کچھ صورِ کونیہ ہوتی ہیں، جن میں ارواح و امثالِ علوی و سفلی، اجسام یعنی عناصر و موالید، جمادات و نباتات اور حیوانات وغیرہ ہیں۔ گویا ابتدائی ہویتیں صورِ الٰہیہ یا تجلیات ہیں اور ابتدائی ہویتوں کے بعد کی چیزیں جو ان سے پیدا شدہ ہیں، مرکب اور مرکب در مرکب، وہ اشیائے کونیہ اور تنزّلات ہیں۔ پھر ان سے آگے اور ان سے آگے ایک سلسلہ چلتا ہے۔ بس تجلیات بھی اشیاء ہیں، لیکن بے رنگ ہیں۔ اور تجلیات سے پیدا شدہ تنزلات و اشیائے کونیہ رنگ برنگ

ہیں۔ان کے اندر اللہ تعالیٰ کے کمالات کا یوں ظہور ہوتا ہے کہ بے ساختہ ان کے اندر غور کر کے دل سے یہ صدا بلند ہوتی ہے: ﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا﴾۔

ترجمہ: ''اے ہمارے پروردگار! آپ نے یہ سب کچھ بے مقصد پیدا نہیں کیا''۔

اور بندہ یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے:

''لَآ اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْكَ اَنْتَ كَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِكَ''۔

ترجمہ: (اے پروردگار!) میں آپ کی تعریف کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ آپ اس شان سے ہیں، جس شان سے آپ نے اپنی خود تعریف فرمائی ہے''۔

اس کارخانہ کی ساری چیزیں گویا وجودِ منبسط کے فرش پر ابھرتی ہیں یا اس کی عکسی صورتیں ہیں، جو اسمِ الٰہی کے آئینہ میں چھپی ہوئی ہیں۔ بس یہ سب کچھ تو ظاہر ہوتا ہے، لیکن ان سب کا قیوم اِن ظلال کے نقاب میں مستور ہو جاتا ہے۔ عقل مند اگرچہ ظلال کے حسن و کمال کا معترف ہوتا ہے، لیکن وہ اس حسن و کمال کے پیچھے چھپے ان ظلال کے قیوم کو بھانپ لیتا ہے، جس کی وجہ سے یہی ظلالی حجابات اس کے لئے نورِ معرفت بن جاتے ہیں۔

ظلال کے کمال اور حسن کا ایک تجزیہ:

کمال اور حسن ظلال کی دو صفات ہیں۔ ظلال میں اگر وہ باتیں پائی جائیں، جو ظلال میں ہونی چاہئیں، تو یہ کمال ہے اور اگر ظلال کے مختلف اجزاء میں ایک موزوں تناسب پایا جائے، تو وہ ان کا حسن ہے۔ ہر چیز کا ایک تو اپنا معیار ہوتا ہے۔ وہ چیز اس معیار کے جتنا قریب ہو، اتنی وہ کامل ہوتی

ہے۔ اور دوسرا ارد گرد کی چیزوں یا ماحول سے اس چیز کا مناسب اور معتدل تناسب ہوتا ہے۔ دونوں کو دیکھ کر ہی اس کے بارے میں حسین یا بدصورت ہونے کا حکم لگایا جاسکتا ہے۔

مثلاً: جس انسان میں بولنے، سننے، سوچنے، دیکھنے، علم یا تقویٰ جیسی صفات پائی جاتی ہوں، تو اس انسان کو ان صفات کے لحاظ سے باکمال سمجھا جاتا ہے اور اگر اس کے ہاتھ، پاؤں، قد، ناک وغیرہ کے نقشہ میں باہمی تناسب اچھا ہو، تو وہ **حسین** بھی سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر ظلال کی فطرت کے مطابق ان کی صفات میں کوئی کمی یا نقصان ہو، تو اس کو ''نقص'' کہتے ہیں اور اگر ان میں ان کی فطرت کے برعکس صفات پائی جائیں، تو اس کو ''قبح'' کہتے ہیں۔ قبح کی پیدائش کے اسباب متعدد ہو سکتے ہیں۔ مثلاً: ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ ان کے بننے کے نظام میں کوئی کمزوری پائی جائے یا پھر ان کے مددگار عوامل کمزور ہو جائیں اور مخالف عوامل قوی ہو جائیں۔ جبکہ نقص کی وجہ ان کے بننے میں باہمی ہم آہنگی نہ ہونا ہو سکتی ہے۔ مثلاً: آئینہ کو ترچھا رکھا جائے، تو شکل میں بگاڑ ظاہر ہو جاتا ہے۔

پھر ان میں دو طرح کی ترکیبوں سے دو قسمیں مزید بنیں گی۔ ایک قسم یہ ہے کہ باکمال ہو، لیکن قبیح ہو اور دوسری قسم یہ ہے کہ حسین ہو، لیکن ناقص ہو۔ جن ظلال میں قبح ہو، اگر ان کے قبح کو دوسرے ظلال کی مدد سے دور کیا جائے، تو اس کو تکمیل کہیں گے اور جن ظلال میں نقص ہو، اگر ان کے نقص کو کسی دوسرے ظل یا ظلال کی مدد سے دور کیا جائے، تو اس کو تحسین کہتے ہیں۔ بعینہٖ اسی طرح حسن کو اگر کوئی دوسرا ظل ضائع یا کم کر دے، تو اس کو اس کی تقبیح کہتے ہیں۔

ظلال کے ذریعے ظلال کی تکمیل و تحسین اور تقبیح و تنقیص میں وہ تمام نظام آجاتے ہیں، جو

مطلوبہ منافع حاصل کرنے کے لئے ہیں۔ مثلاً: دوائی کا نظام، معاشی نظام اور تعلیمی نظام وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح نقصان اور خرابی پیدا کرنے کے لئے زہر، ناموافق حالات اور گمراہی کے اسباب وغیرہ۔ یہ سب آتے ہیں۔ یہ تو ظلال کی مختلف قسمیں ہوئیں، لیکن کیا وجودِ منبسط بھی ان ظلال سے موصوف ہے؟ تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ہاں، وجودِ منبسط ان ظلال سے موصوف ہے، لیکن انتزاعی طور پر۔ کیونکہ انسانی ذہن ان کو وجودِ منبسط سے پیدا کرتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا وجودِ منبسط بھی ظلال کے احکامات سے موصوف ہوتا ہے یا نہیں؟

جواب یہ ہے کہ اس میں تفصیل ہے۔ اس بارے میں ایک کلی ضابطہ یہ ہے کہ دیکھنا چاہئے کہ ظلال کے احکام کی نوعیت کیا ہے؟ اگر وہ ایسے احکام ہیں کہ جن سے ظلال کے کمالات کا مفقود ہونا لازم آتا ہے یا ان کے نظاموں میں خلل آتا ہے یعنی ان ظلال سے متعلق کوئی منفی صورتِ حال پیدا ہوتی ہے، تو ان احکام سے وجودِ منبسط متصف نہیں ہوگا۔ کیونکہ وجودِ منبسط محض نور ہی نور ہے۔ لیکن ہر وہ چیز جس سے خیر وجود میں آئے، اس سے وجودِ منبسط موصوف ہوتا ہے، لیکن اس سے اس کے نور کے حجابات کا کوئی تعلق نہیں۔ جیسے: سورج کی روشنی آرہی ہو اور اس کے سامنے کوئی حجاب آجائے، جو کسی چیز کے لئے سورج کی روشنی سے مانع ہو جائے، تو اس میں سورج کا کیا قصور ہو گا؟ پس چاہئے کہ ان حجابات کو رفع کیا جائے، تاکہ اس نور سے استفادہ ہو سکے۔ پس ظلال کا کوئی عیب وجودِ منبسط سے منسوب نہیں کیا جاسکتا، بلکہ عیب کو اسی ظل سے ہی منسوب کرنا ٹھیک ہے۔ مثلاً: روشنی کا ایک source (ذریعہ) ہے، جو تمام چیزوں کو روشن کر رہا ہے، اب اگر کوئی چیز کسی

آڑ میں آکر روشن نہیں ہے، تو عیب روشنی کے source (ذریعہ) کا نہیں ہے۔

اس کے الطاف شہیدی تو ہیں مائل سب پر
تجھ سے کیا بیر تھا گر تو کسی قابل ہوتا

اسی طرح بادیُ النظر میں بعض چیزوں میں نقصان نظر آتا ہے، لیکن اگر اس کو پوری کائنات کے تناظر میں دیکھا جائے، تو اس کا فائدہ معلوم ہو جاتا ہے۔ جیسے: چاند میں روشنی انعکاسی ہے اور سورج سے بہت کم ہے اور اس کی سطح کھردری ہے، لیکن اسی سبب سے ہی چاند کی روشنی آنکھوں کو بھلی لگتی ہے۔ اسی طرح کسی انسان کا سیاہ رنگ والا ہونا عیب سمجھا جاتا ہے، لیکن کالی داڑھی اور کالے بال سب کو بھلے لگتے ہیں۔

اس لئے وجودِ منبسط سے جس چیز کا بھی تعلق ہے، وہ خیر ہے، اگر اس سے اس کو کوئی حجاب نہ ہو۔ اچھی چیزوں کے ساتھ بری چیزوں کے پیدا کرنے کی بھی یہی علت ہو سکتی ہے۔ اسی طرح لوہے سے تلوار اور چھری بنائی جاسکتی ہے، لیکن اگر لوہے سے کسی شخص نے عیب دار چھری یا تلوار بنائی، تو اس کی وجہ سے لوہے پر کوئی الزام نہیں۔ محض کاریگری کا فرق ہے۔ اسی طرح وجودِ منبسط سب ظلال کا قیوم ہے، لیکن اگر ان میں اچھائی ہے، تو وہ وجودِ منبسط سے ہے اور اگر ان میں کوئی برائی ہے، تو اس کا تعلق وجودِ منبسط کے غیر کے ساتھ ہے۔

خانقاہ رحمکاریہ امدادیہ، راولپنڈی کے شب و روز

الحمد للہ، خانقاہ رحمکاریہ امدادیہ میں حضرت شیخ سید شبیر احمد کاکاخیل صاحب دامت برکاتہم کے دروس و خطبات کا سلسلہ نہایت پابندی کے ساتھ جاری و ساری ہے جس سے طالبانِ حق مسلسل سیراب ہو رہے ہیں۔ دروس کی تفصیل درج ذیل ہے:

آج کی بات

روزانہ صبح بعد از نمازِ فجر تین مختصر بیانات ہوتے ہیں:

- درسِ قرآن
- ریاض الصالحین سے ایک حدیث شریف کی تعلیم
- مطالعہ سیرت بصورت سوال

جمعۃ المبارک:

- کسی ایک مسجد میں جمعہ کا بیان
- ختم قرآن، مجلسِ درود شریف اور اس کے بعد جمعہ کی آخری گھڑیوں میں دعا (عصر اور مغرب کے درمیان)

ہفتہ:

- حضرت مولانا اشرف سلیمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب **"سلوکِ سلیمانی"** اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب **"تربیت السالک"** کا درس (بعد نمازِ مغرب)

- بعد از عصر (ہفتہ) تا اشراق (اتوار) تک مرد حضرات کے لیے خانقاہ میں اصلاحی و تربیتی جوڑ ہوتا ہے، جس کے معمولات یہ ہیں: نمازِ عصر کے بعد انفرادی ذکر، نمازِ مغرب اور اوابین کے بعد جوڑ بیان اور مجلسِ ذکر میں شرکت، نمازِ عشاء کے بعد منزل جدید کی تلاوت، سورہ ملک کی تلاوت، ختمِ خواجگان، مجلسِ درود شریف، حضرت مولانا ڈاکٹر عبد الحیی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''اسوۂ رسولِ اکرم ﷺ'' سے تعلیم، کھانے پینے اور سونے کے آداب و سنن کی تعلیم، کھانا، آرام، نمازِ تہجد اور انفرادی معمولات، ختمِ قرآن اور نمازِ اشراق۔

اتوار:

- (خواتین کے لیے اصلاحی بیان) دن 11 سے 12 بجے تک خانقاہ میں شرعی پردے کے اہتمام کے ساتھ۔ **نوٹ:** ہر ماہ میں کسی ایک اتوار کو خانقاہ میں صبح 9 سے 12 بجے تک تین گھنٹے کا خواتین کیلئے اصلاحی و تربیتی خصوصی جوڑ ہوتا ہے۔
- فرض عین علم کی تعلیم (بعد نمازِ مغرب)
- انگریزی میں بیان (رات 8 بجے)

پیر:

- پشتو میں بیان (بعد نمازِ عصر)
- اصلاح و تربیت کے متعلق (بذریعہ وٹس ایپ، ای میل اور ٹیلی فون پر موصول ہونے والے) سوالات کے جوابات (بعد نمازِ مغرب)

منگل:

- مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کی معرکۃ الآراء کتاب مثنوی شریف کا درس (بعد نمازِ مغرب)

بدھ:

- حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات شریفہ سے درس (بعد نمازِ مغرب)

جمعرات:

- حضرت سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب **"سیرت النبی ﷺ"** سے درس (بعد نمازِ مغرب)
- درود شریف کی مجلس (درودِ تنجینا ایک ہزار مرتبہ، اسکے بعد نعت شریف، چہل درود شریف کی سماعت اور مناجاتِ مقبول سے دعا)

بزرگوں کی تحریریں کیوں پڑھنی چاہئیں؟

بزرگوں کی تحریریں اُن کی زندگی کا نچوڑ ہوتی ہیں۔ ہم ہزاروں تجربات کرکے جس چیز تک نہیں پہنچ سکتے ان کی تحریروں سے ہم اُن چیزوں تک آناً فاناً پہنچ سکتے ہیں۔ اس وجہ سے بزرگوں کی ان تحریروں میں ریسرچ کرنا جس سے ہمارا یہ مقصد حاصل ہوتا ہو بہت مفید ہے۔ پھر ان میں مجددین حضرات کا رنگ بالکل الگ ہوتا ہے کیونکہ مجددین حضرات کی تحقیقات عمومی دین کے لئے ہوتی ہیں جو کہ اس وقت کے لوگوں کی سطح کے مطابق پیدا شدہ فروگزاشتوں کو دور کرکے دین کو اصلی صورت میں ظاہر کرتے ہیں۔

اگر صرف ایک آخری مجدد کی اتباع کی جائے تو وہ بھی کافی ہوتی ہے لیکن اگر چند متواتر مجددین کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے تو اس سے حالات کے مطابق مطلوبہ تبدیلی لانے کا فن آشکارہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس کے بعد اگر کوئی تبدیلی آتی ہے تو اس کے لئے "by the process of extrapolation" حل ڈھونڈنا آسان ہو جاتا ہے۔

اس کتاب میں ہم نے اپنے ان اکابر کے فیوضات کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے جو کہ قلب، عقل اور نفس کی اصلاح کے متعلق راہنمائی میں ایک اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قلبی اعمال بہت اونچے تھے جو کہ قلبی واردات والے حضرات کی راہنمائی کرتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے عقلی اعمال بہت زیادہ اونچے تھے۔ اس وجہ سے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحریرات کا فائدہ اُن لوگوں کو زیادہ ہوتا ہے جن کی عقلیں بہت آگے کا سوچتی ہیں۔ حضرت کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صفائی نفس کے اعمال بہت اعلیٰ تھے اس وجہ سے حضرت کی تعلیمات نفس کی صفائی کے کاموں میں مشعلِ راہ ہیں۔ حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات آج کل کے منطقی موشگافیوں کے جوابات کے لئے ماحول بنانے اور صلاحیت پیدا کرنے کے لئے مفید ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے اکابر کی تعلیمات سے پورا پورا مستفید ہونے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین

051 5470582 0332 5289274

sshabirkakakhel@gmail.com,
sshabir@tazkia.org

حضرت شاہ صاحب مدظلہ کو سوالات بھیجنے کیلئے 0315 5195788

www.tazkia.org